وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا

بیاد : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ عالمی

ترجمان القرآن

ستمبر ۲۰۱۴ء

مدیر : پروفیسر خورشید احمد

الابلاغ ٹرسٹ

ماہنامہ عالمی

ترجمان القرآن

جلد۴، عدد ۹، ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ، ستمبر ۲۰۱۴ء

مدیر: پروفیسر خورشید احمد   نائب مدیر: مسلم سجاد

ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰ فون: ۳۵۴۲۵۳۵۶-۰۴۲ فیکس: ۳۵۴۳۲۱۹۴ - tarjumanq@gmail.com

انتظامی امور: ۴۳- زینب پارک، نزد منصورہ، لاہور-۵۴۷۹۰- فون: ۳۵۴۲۷۹۱۶-۰۴۲- فیکس: ۳۵۴۲۷۹۱۵

موبائل: ۴۱۹۲۷۰۰-۰۳۰۷ ای میل: tarjuman@tarjumanulquran.org ویب: www.tarjumanulquran.org

- قیمت فی شمارہ: ۳۵ روپے ● زرسالانہ: ۳۵۰ روپے ● ۵ سال کے لیے: ۱۵۰۰ روپے ● معاونِ خصوصی: ۶۰۰۰ روپے
- بنگلہ دیش، بھارت ۱۴۰۰ روپے ● ایران، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۸۰۰ روپے ● امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۲۱۰۰ روپے

بنک اکاؤنٹ: بنام عالمی ترجمان القرآن، BOP, Ichhra, Br. Code 093, Lahore A/c 800-792-000-0

زیر اہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

یہ ہیں مولانا مودودی......!

مولانا مودودی کے خلاف آپ جو چاہیں کیجیے، لیکن...... یہ حقیقت سمجھ لیجیے کہ مولانا مودودی ہے کون؟

ـــــ یہ وہ شخص ہے جس نے اِس دورِ الحاد میں خالص عقلی اسلوب سے اسلام کے عقیدوں، اس کے اصولوں، اس کے فلسفے، اس کے قوانین وضوابط، اس کی اخلاقی قدروں، اس کی تہذیبی روایات اور اس کے آداب وشعائر کو نکھار کر پیش کیا ہے۔ اس نے اسلام کو جامد مذہب کی سطح سے اُٹھا کر اجتماعی دین اور انقلابی تحریک کی صورت میں اُجاگر کر دیا ہے، اس نے متزلزل ایمانوں کو ازسرِنو مستحکم کر دیا ہے، اس نے اکھڑے ہوئے دلوں کو دوبارہ جما دیا ہے، اس نے اُلجھے ہوئے دماغوں کی ساری گرہیں کھول دی ہیں۔ اس نے نئی اُمنگیں اور نئے جذبات دیے ہیں۔اس نے زندگی کے یخ بستہ سمندر میں حرکت پیدا کی ہے۔

ـــــ ہاں! یہ وہ شخص ہے جس کا پیغام ہزاروں دلوں میں اس طرح اُتر گیا ہے کہ اس نے زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے، لوگوں کے دل ودماغ بدل گئے ہیں، لوگوں کے اخلاق کی کایا پلٹ گئی ہے، لوگوں کی دوستیوں اور دشمنیوں کی سمتیں تبدیل ہوگئی ہیں، گھروں کے گھر ہیں کہ جن کی تہذیب اور جن کا کلچر نئے سانچوں میں ڈھل گیا ہے۔نوجوان میں جو کل تک خدا اور مذہب کا مذاق اُڑاتے تھے، لیکن آج اسی خدا کے جاں نثار بندے اور اس کے مذہب کے اصولوں کے لیے دن رات جانفشانیاں کرنے والے ہیں .... خواتین ہیں کہ جن کی جنتِ نظر اگر کل تک مغربی طرز کی زندگی تھی تو آج ان شع ہائے خانہ کی کرنوں سے کتنے ہی خاندانوں میں اسلامی ماحول پیدا ہو رہا ہے۔طلبہ ہیں کہ جنھیں آپس کی دھڑے بندیوں اور سیاسی لیڈروں کے اشارے پر ہنگامہ آرائیوں سے فرصت نہ ملتی تھی، آج اپنے آپ کو ایک اسلامی نظام کے کل پُرزے بنانے کے لیے ذہنی واخلاقی تیاری میں مصروف ہیں۔ادیب ہیں کہ جو کل تک دولت اور شہرت کی طلب میں اخلاق سوز تفریحی نگارشات کی تخلیق میں دماغی قویٰ کو برباد کر رہے تھے، آج ان کے قلم خدا و رسولؐ کی امانت بن گئے ہیں۔تاجر اور وکیل بدلے ہیں، سرمایہ دار اور مزدور بدلے ہیں، زمیندار اور کسان بدلے ہیں، عالم اور اَن پڑھ بدلے ہیں، شہری اور دیہاتی بدلے ہیں ـــــ اور آئے دن اس شخص کی دعوت یہ انقلابی عمل دکھا رہی ہے۔

ـــــ ہاں! یہ وہ شخص ہے جو ایک کتابی اور خطابتی پیغام دے کر ہی نہیں رہ گیا۔اُس نے دین کے لیے ایک تحریک بپا کر دی ہے۔ ('اشارات'، نعیم صدیقی، ترجمان القرآن، جلد۴۲، عدد۵، ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ، اگست ۱۹۵۴ء، ص۱۰-۱۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

رواداری، برداشت اور معاشرتی اصلاح

ڈاکٹر انیس احمد

اگست ۲۰۱۴ء کا یہ مہینہ پاکستان پر بہت ہی بھاری پڑا ہے۔ اس وقت ملک اور قوم جس خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہیں، اس پر ہر محبِ وطن دل گرفتہ اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بہ دُعا ہے کہ حکومت اور اسے چیلنج کرنے والے دونوں ہی گروہ ذاتی اور گروہی مفادات اور اَنا کے ہر جذبے سے بلند ہوکر، اس ملک کے مفاد میں، جو تاریخ اور ملت اسلامیہ پاک و ہند کی ہم سب کے ہاتھوں میں بڑی قیمتی امانت ہے، افہام و تفہیم کے ذریعے دستور، قانون اور اجتماعی اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے سیاسی حل نکالیں، اور جو خطرات سیاسی اُفق پر منڈلا رہے ہیں ان کے پورے اِدراک کے ساتھ تصادم اور خون خرابے کی ہر شکل سے اجتناب کریں۔ جماعت اسلامی نے الحمدللہ اس زمانے میں مفاہمت اور مسائل کے سیاسی حل کے لیے جو کوششیں بھی کی ہیں ہم ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ ان کے اچھے نتائج نکلیں گے۔ جماعت اسلامی اس جدوجہد میں تنہا نہیں، دوسری سیاسی اور دینی قوتیں بھی اپنا اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ ہمیں توقع ہے اور شب و روز اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے ہیں کہ وہ ان کوششوں کو بارآور فرمائے اور یہ ملک تصادم، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، تنقید اور تنقیص میں ہر حد کو پامال کردینے اور کفن اور قبرستان کے المیے سے بچ جائے، اور ملک و ملت کے بدخواہ جو خطرناک کھیل پورے عالم اسلام میں کھیل رہے ہیں اس سے پاکستان محفوظ رہے۔ بلاشبہہ حالات بے حد سنگین ہیں

لیکن ہمیں اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور ہر سطح پر اپنی کوششوں کو جاری رکھنا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بے حد وحساب ہے اور اس کا ارشاد بھی یہی ہے کہ اہلِ ایمان کبھی بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں (لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ط الزمر ۳۹:۵۳)۔

یہ صورتِ حال کیوں رُونما ہوئی، بگاڑ کے اس مقام تک پہنچنے میں کس نے کیا اور کتنا کردار ادا کیا اور مسئلے کے مستقل حل خصوصیت سے نظامِ حکمرانی کی اصلاح، حقیقی اسلامی جمہوریت کے فروغ، اور ایک عوام دوست فلاحی معاشرے کا قیام، انتخابی نظام کی تشکیلِ نو، سیاسی اختلاف اور تبدیلی کے طریقے کے بارے میں صحیح حدود کا تعیّن اور ان کے مطابق عملی جدوجہد کے آداب کا تعیّن اور ان کا احترام، اختلاف کی حدود اور تنقید واحتساب کی زبان ــــــ یہ سب وہ اُمور ہیں جن پر کھل کر بات کرنے اور قومی اتفاق رائے کے ذریعے سیاست کو صحیح خطوط پر استوار کرنے، اور ہر سطح پر اور ہر قوت کے لیے دستور اور قانون کی حدود میں رہ کر اپنے اپنے پروگرام کے مطابق جدوجہد کرنے کے مکمل اور کھلے مواقع فراہم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ان شاء اللہ!

آیندہ ہم ان اُمور کے بارے میں اپنی معروضات پیش کریں گے لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ سے ہدایت، رہنمائی اور توفیق کی دعاؤں کے ساتھ حکومت اور اسے چیلنج کرنے والی قوتوں سے پوری دل سوزی کے ساتھ یہی درخواست کرتے ہیں کہ تصادم سے ہر قیمت پر پرہیز کریں۔ ہر پارٹی چند قدم پیچھے ہٹائے اور ملک وقوم کے اعلیٰ مفاد میں بیچ کا راستہ نکالنے اور ماضی کے اُمور پر انتقام کی جگہ آگے کے حالات کی اصلاح کو اولیت دے۔ احتساب ضرور ہونا چاہیے لیکن اس کے لیے بھی مناسب ماحول بنانا ضروری ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ احتساب قانون کے دائرے میں ہونا چاہیے، ورنہ احتساب انتقام بن جاتا ہے جو بڑے فساد کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ اس سے بچنا اس وقت ہم سب کے لیے ضروری ہے۔

ان حالات میں، اس دُعا اور گزارش کے ساتھ ہم اس مہینے کے 'اشارات' کو کچھ

اصولی باتوں کی یاددہانی کے لیے مخصوص کر رہے ہیں تاکہ ہم سب اپنا اپنا جائزہ لے سکیں اور نفس کی اُکساہٹوں سے بلند ہوکر اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس کے ساتھ ایک مظلوم قوم اور ملک کے مفاد کی خاطر وہ راستہ اختیار کریں جو فساد سے پاک اور خیروصلاح کی راہوں کو استوار کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتۃ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ o (اعراف ۷:۲۳) ''اے رب، ہم نے اپنے اُوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہوجائیں گے''۔ (مدیر)

قرآنِ کریم نے اہلِ ایمان کی جماعت اور معاشرے کو باہم دگر محبت، نرمی، رواداری، گرم جوشی، عفوودرگزر اور اخوت و یک جائی کی صفات سے متصف جماعت قرار دیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہیں جو اہلِ ایمان کے اپنے رب کو رب مان کر اس پر مستقیم ہوجانے اور اپنی عبادات اور قربانیوں کو صرف اللہ کے لیے خالص کردینے کے نتیجے میں شخصیت کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ ان صفات پر مبنی جماعت جہاں آپس میں ریشم کی طرح نرم ہوتی ہے، وہاں ایک محبت کرنے والے باپ کی طرح بیک وقت گرفت کرنے والی اور شفیق، اور ایک درگزر کرنے والے بھائی کی طرح نظرانداز کرنے والے معاشرے کی مثال ہوتی ہے۔

رب کریم نے اس جماعت کے بارے میں یوں بیان فرمایا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح ۴۸:۲۹) ''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں''۔ اس آیت مبارکہ میں اہلِ ایمان کی دو بنیادی صفات کو، جو ان کی پہچان قرار دی گئی ہیں نمایاں کیا گیا ہے۔ ایک مثبت صفت جس کا تعلق ان کے باہمی تعلقات اور معاملات سے ہے۔ یہ ہے کہ جب وہ آپس میں کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو اپنے جائز حق کو بھی اپنے بھائی کے لیے قربان کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ جب ان کے ایک بھائی کو دنیا کے کسی خطے میں تکلیف پہنچتی ہے وہ غزہ ہو، بنگلہ دیش ہو، تھائی لینڈ ہو، کشمیر ہو، عراق ہو، مصر ہو یا شام، اس کے درد کی کسک وہ نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ ایک رحیم شخصیت ہونے کی بنا پر اس کو سکون پہنچانے، امن دینے، ان کی جان و مال کے تحفظ میں اپنی تمام قوت صرف کردیتے ہیں۔

ایک رحیم ماں یا باپ یہ کیسے برداشت کرسکتے ہیں کہ ان کا لختِ جگر درد میں مبتلا ہو اور وہ سکون کی نیند سو سکیں۔ ان کی بے چینی اور اضطراب محض پریشانی کی حد تک نہیں بلکہ ان کے عمل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ آگے بڑھ کر اپنا مال، اپنی جان، اپنی قوت، اپنی صلاحیت ہر شے کے ساتھ اپنے بھائی کو ظلم سے بچانے، اس کی جان کا تحفظ کرنے، اس کے مال کو ظالم سے بچانے کے لیے بے خطر میدان میں کود پڑتے ہیں۔ یہ ایک عظیم عطیہ الٰہی ہے کہ وہ جو کل تک ایک دوسرے کے مال پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے، قبائلی تعصّبات اور نسلی دشمنیوں میں گھرے ہوئے تھے، اس نے انھیں آپس میں رحیم بنا کر ان کے دلوں کو، ان کی روحوں کو، ان کی فکر کو، ان کے طرزِ عمل کو ایک اعتماد کے رشتے میں جوڑ دیا اور وہ دیکھتے دیکھتے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔

دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ کفار پر سخت (اشداء) ہوتے ہیں۔ ایک تو خود کفر میں سخت ہونا ہے جس کا تذکرہ سورۂ توبہ میں یوں ہوا: اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا (التوبہ ۹:۹۷) ''یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں''۔ کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کو شدید قرار دیا گیا ہے: وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (البقرہ ۲:۱۹۶) ''خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے''۔ دوسری جانب کفار پر سخت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جب اہلِ ایمان اور اہلِ کفر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوتے ہیں تو پھر خون اور خاندان یا قبیلے کی محبت درمیان میں نہیں آتی۔ نظریاتی جنگ میں اہلِ ایمان اہلِ کفر کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ دین کے معاملے میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے اور اپنے موقف پر جم کر استقامت کے ساتھ کفر کو اس کے انجام تک پہنچاتے ہیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ مسلم دنیا میں اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کبھی فرقہ پرستی کے نام پر اور بعض اوقات قبائلی عصبیت اور جغرافیائی قومیت کی بنیاد پر ایک مسلمان دوسرے کے سامنے صف آرا ہو جاتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ جنھیں باہم شیر و شکر ہونا چاہیے تھا نہ صرف زبان سے بلکہ ہاتھ سے اپنے بھائی کو نقصان پہنچانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں؟ انفرادی اور معاشرتی سطح پر تشدد، عدم رواداری اور عدم برداشت کیوں پیدا ہوتی ہے؟ کیا اس کا علاج مزید شدت، عسکریت اور قوت کے ساتھ اس کو دبانے سے کیا جاسکتا ہے یا ان برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کرنے کے لیے کسی خاص

حکمت عملی کی ضرورت ہے؟ اس تحریر کا مقصد ان سوالات کا جواب تلاش کرنا ہے۔

انسانی معاشرے میں بُرائی، ظلم و استحصال اور طاغوت کا آغاز غیر محسوس طور پر ایک بظاہر معصومانہ غلطی سے ہوتا ہے اور وہی غلطی جو کل تک غیر محسوس تھی انسان کو گھناؤنے جرم تک لے جاتی ہے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے کہ برائی کا آغاز انسان کے دل پر ایک چھوٹے سے داغ سے ہوتا ہے۔ اگر مسلمان توبہ کرلے اور نیکی کی طرف پلٹ آئے تو یہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن اگر وہ دوبارہ غلطی کا ارتکاب کرے تو یہ داغ بڑھتا رہتا ہے، حتیٰ کہ یہ پورے قلب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ جب پورا قلب اس کی گرفت میں آجاتا ہے تو پھر انسان کے ذہن سے برائی کے برائی ہونے کا احساس ختم ہوجاتا ہے۔ ہم عموماً یہ بات کہتے ہیں کہ کیا کوئی انسان ایسا گھناؤنا جرم کرسکتا ہے کہ وہ ایک بچی یا بچے کو زیادتی کا نشانہ بنائے، یا کسی مسلمان بھائی پر قتل کی نیت سے ہاتھ اُٹھائے، یا کسی راہ چلتے کو، یا مسجد میں اللہ کے حضور اپنا سر جھکانے والے کو مسجد میں گھس کر نشانۂ قتل بنائے؟ اس حدیثِ مبارکہ میں سمجھایا گیا ہے کہ شقاوتِ قلبی کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کریم جن دلوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ شقاوتِ قلبی میں پتھر بلکہ اس سے زیادہ سخت ہوجاتے ہیں کیونکہ بعض پتھر ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں اور ان سے پانی کا چشمہ رواں ہوجاتا ہے۔ لیکن جو قلب احساسِ بندگی کو دبا کر نفسی نفسی کے زیراثر داغ دار ہوچکے ہوں پھر وہ انسان جن کے دل میں ایک دھڑکنے والا قلب سلیم نہ ہو بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہو تو وہ نہ اپنی آنکھ سے سچّائی اور جھوٹ میں تمیز کرسکتے ہیں، نہ اپنے کان سے اچھی اور فحش بات میں تمیز کرسکتے ہیں۔ قرآن کریم نے صحیح کہا ہے: صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَۙ (البقرہ ۲:۱۸) ”یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے“۔

عدم رواداری، شدت پسندی، ظلم، ناانصافی، حقوق پر ڈاکا، بچوں اور خواتین کے ساتھ ظالمانہ رویہ، معاشرے میں دھوکا دہی، رشوت، عدم تحفظ، غرض تمام برائیوں کا آغاز ایک فرد کے دل کے داغ دار ہوجانے سے ہوتا ہے اور جب کئی دل داغ دار ہوجائیں تو پورے معاشرے میں فساد و بدامنی پھیل جاتی ہے۔

انسانی حقوق کی پامالی

اس داخلی سبب کے ساتھ ساتھ بعض بیرونی عناصر بھی انسان میں انتقام، توڑ پھوڑ، ظلم و استحصال کے جذبے کو فروغ دیتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم انسانوں کے حقوق کا پامال کرنا ہے۔ اگر ایک معاشرہ یا ریاست اپنے باشندوں کو ان کے حقوق سے محروم کرے اور خود آسایش اور ثروت کی زندگی گزارے تو حقوق سے محروم افراد میں انتقامی جذبہ اُبھرنا ایک فطری عمل ہے۔ ایک حدیث میں اس طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پڑوسی کو عمدہ اور قیمتی پھل نہ کھلا سکتا ہو تو کم از کم پھل کھانے کے بعد ان کے چھلکے اپنے دروازے کے سامنے گلی میں نہ پھینکے۔ احساسِ محرومی اور فقر انسان میں جو ردعمل پیدا کرتا ہے حدیث میں اسے شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور شرک ایک شخص کو کسی بھی ایسے کام پر آمادہ کرسکتا ہے جو اسلام کے اعلیٰ اخلاقی رویے کی ضد ہو۔ چوری، ڈاکا، قتل کا ایک سبب یہی احساسِ محرومی ہوتا ہے کہ ایک فرد یہ سمجھتا ہے کہ جس دولت میں سے اسے کچھ ملنا چاہیے تھا وہ صرف چند افراد کے قبضے میں ہے، اس لیے وہ اسے غیر اسلامی ذرائع سے چھین کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ریاست اور معاشرہ اپنی اس ذمہ داری سے اسی وقت عہدہ برآ ہوسکتا ہے جب وہ ناداروں کو ان کا حق دے، بے علم افراد کو تعلیم سے آراستہ کرے اور بے روزگار افراد کو روزگار فراہم کرے۔ یہ شہریوں کے وہ حقوق ہیں جو اسلام نے آج سے تقریباً پندرہ سو سال قبل قرآن اور سنت کے واضح احکامات کی شکل میں ہم کو دیے ہیں۔ ہم نہ ان احکامات سے واقفیت حاصل کرنے کی جستجو کرتے ہیں اور نہ انھیں معاشرے اور ریاست میں نافذ کرنے کی۔ آخر زکوٰۃ کو ایک عبادت اور فریضہ قرار دینے کا مقصد اور کیا تھا۔ زکوٰۃ کو ایک ٹیکس قرار دینا زکوٰۃ کے مفہوم اور روح سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ یہ دراصل معاشرے سے افلاس، فقر، بھوک، جہالت، بیماری اور عدم تحفظ کے خاتمے کے شرعی نظام کا نام ہے۔ نہ صرف زکوٰۃ بلکہ وسیع تر پیمانے پر صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے اسلامی معاشرے کے ہر مجبور، نادار اور ضرورت مند کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

تعلیم

معاشرے اور فرد میں بغاوت و انتقام کا جذبہ پیدا کرنے میں جہالت کا کردار اہم ہے۔ اسی بنا پر قرآن و سنت میں تعلیم کو ایک فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم محض چند صلاحیتوں کا پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ بنیادی اخلاقی رویوں کے اختیار کرنے کا نام ہے۔ وہ تعلیم اُمت کے لیے زہر ہے جو اخلاق و آداب اور تعمیر سیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک اعلیٰ معاشی مزدور تو پیدا کرتی ہو لیکن اسے اخلاق، عدل و انصاف، سچائی، پابندیِ عہد اور انسانوں کے حقوق سے آگاہ نہ کرتی ہو۔

گھر کا ماحول

انسانی کردار کی تعمیر کی پہلی بنیاد گھر کی چار دیواری میں رکھی جاتی ہے۔ اگر ایک بچے کو ماں باپ کی طرف سے محبت، توجہ اور اچھے اخلاق و عادات کو پیدا کرنے پر متوجہ نہ کیا جائے اور بچوں کو مصروف رکھنے اور ان کے سوالات سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ٹی وی اسکرین کے حوالے کردیا جائے، تو پھر وہ روزِ اوّل سے تشدد، مار دھاڑ، قتل و غارت، چالاکی، دھوکا دہی اور عریانیت و فحاشی کو کارٹونوں کی شکل میں بار بار دیکھ کر اُس حدیث کے مصداق احساسِ مروت، احساسِ شرم، احساسِ فرض سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں جس میں دل کی سختی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جدید تحقیقات یہ بتاتی ہیں کہ ایک بچہ عموماً دن میں چار تا آٹھ گھنٹے ٹی وی کے سامنے گزارتا ہے، اور مسلسل چار تا آٹھ گھنٹے تک جب آنکھ کے پردے پر تشدد کے مناظر دہرائے جائیں تو اُن کے نقوش یادداشت کے پردے پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک بچے کا ہنسنا، رونا، روٹھنا، مطالبہ کرنا، چلنا، اپنے چہرے سے مختلف قسم کے تاثرات کا اظہار کرنا، غرض اس کا پورا کردار کارٹون کے کردار کا ایک چربہ بن جاتا ہے۔

گھریلو رویے

• جنسی مساوات (Gender Equality) کے زیرعنوان خاندان کے تقدس و احترام کو بڑی تیزی کے ساتھ پامال کیا جا رہا ہے اور اس میں ابلاغ عامہ اور سرکاری تعلیم کے نصاب کا بڑا دخل ہے۔ تعلیمی ادارے سرکاری ہوں یا نجی، دونوں شکلوں میں جو کتب استعمال کی جارہی ہیں

ان میں انفرادی امتیازات (individualities) اور جنسی مساوات کو مثالوں اور بیانات کی شکل میں بار بار دہرایا جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک طالب علم اس مغربی تصور ہی کو حق سمجھتا ہے۔ یہ تصور نہ صرف اس کی ذاتی شخصیت بلکہ اس کی خاندانی زندگی کو اجتماعیت کی جگہ انفرادیت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایک شوہر اور بیوی دونوں اپنی اَنا، ذاتیت اور انفرادیت کے خول میں گرفتار رہتے ہیں۔ ان کی فکر، ان کا طرزِ عمل، ان کا اظہارِ محبت بھی اسی کا اسیر ہوتا ہے اور کسی لمحے بھی اپنے آپ کو بدلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ شوہر کی ہر معاملے میں اپنی پسند، وہ کھانا ہو، لباس ہو، گھر کا رہن سہن ہو، تفریح ہو، باہمی تعلقات ہوں، اور ایسے میں بیوی کا اپنی ذاتی پسند پر اصرار، گھریلو عدم تعاون، جذباتی فاصلے اور آخرکار گرم گفتاری اور پھر گھریلو تشدد تک پہنچتا ہے۔ جدید اعداد و شمار، انتہائی تشویش ناک حد تک یہ پتا دیتے ہیں کہ اس وقت ۸۰، ۸۵ فی صد شادیاں اس بحران یا انتشار سے دوچار ہیں۔ یہ وبا ایک معاشرتی کینسر کی شکل اختیار کر گئی ہے اور جب تک تشدد، خودرائی اور انفرادیت کے بتوں کو گھر کے اندر مسمار نہیں کیا جائے گا، ان بتوں کی پرستش سے معاشرہ پاک نہیں ہوسکتا۔

جو بچے ایسے ماحول میں تربیت پائیں گے جہاں گھر روزانہ ایک معرکۂ جنگ کی شکل پیش کرتا ہو وہ معاشرے کو امن و سکون نہیں دے سکتے۔ جو بچہ باپ کو ماں پر ہاتھ اٹھاتے دیکھتا ہے یا جو ماں باپ اپنے بیٹے کو اپنی بہن کو دھکا دے کر گرانے پر سزا نہیں دیتے وہ گھریلو اور معاشرتی فساد کو کبھی نہیں روک سکتے۔

معاشی استحصال

جس کھیت سے دہقان کو تو روزی میسر نہ ہو لیکن اس کھیت کے مالک کے گھر میں ہر شام محفلِ موسیقی اور پُرتکلف دعوتیں ہورہی ہوں وہ کب تک اپنی ناداری پر نازاں ہوسکتا ہے۔ معاشرے میں معاشی ظلم و استحصال جب بھی بڑھے گا، عدم تحفظ، تشدد اور توڑ پھوڑ کے عمل میں اضافہ ہوگا۔ اس برائی کا دُور کرنا نہ صرف ریاست بلکہ معاشرے کے ہر فرد کا فرض ہے۔ اجتماعی اصلاح کا احساس اس کے لیے مناسب اداروں کا قیام اور سیاسی اور سماجی تحریکات کا ان معاملات میں آگے بڑھ کر اصلاح کا آغاز کرنا ہی معاشرے کو دوبارہ امن و سکون دے سکتا ہے۔

سیاسی عدم استحکام

معاشرے میں جب سیاسی عدم استحکام ہوگا اور کسی کو یقین نہیں ہوگا کہ کل کیا ہونے والا ہے، حکومت کتنے دن کی مہمان ہے تو قانون نافذ کرنے والے اداروں کا تقدس بھی متاثر ہوگا، اور جب قانون نافذ کرنے والے اداروں کا اثر معاشرے میں نہیں ہوگا تو بدامنی، قانون شکنی اور فساد زمین پر پھیلے گا۔ بیرونی دشمن ہمیشہ یہی حکمت عملی اختیار کرتا ہے کہ کسی ملک کو اندرونی خلفشار میں مبتلا کردے تو پھر بغیر کسی جنگ یا عسکری فتح کے وہ دوسرے ملک کو ناکارہ بنا سکتا ہے۔ جب بھی سیاسی عدم استحکام اور بدامنی ہوگی معاشی بدحالی اور بدانتظامی کا دور دورہ ہوگا تو یہ مزید استحصال، ظلم اور عدم تحفظ کو پیدا کرے گا۔ اس طرح بیرونی سرمایہ کار اس ملک کا رُخ کرتے ہوئے ہچکچائیں گے اور مقامی سرمایہ کار اپنا سرمایہ ملک سے باہر منتقل کرنا چاہیں گے۔ نتیجتاً معاشی انتشار، زوال اور بے روزگاری اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوگا۔

اس لیے معاشرتی توڑ پھوڑ کے عمل کو چند خوب صورت سیاسی بیانات سے دُور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے حکومتِ وقت اور معاشرے کے ذمہ دار ارکان کو یکساں طور پر اپنے فرائض کو پورا کرنا ہوگا۔

اخلاق و کردار

کسی بھی معاشرے کے بگاڑ میں سب سے بنیادی دخل اس معاشرے کی اخلاقی اقدار کا ہوتا ہے۔ اگر اخلاق گر گیا تو معاشرہ بھی گرے گا اور اگر اخلاق اعلیٰ اور بلند ہوگا تو معاشرہ بھی صاف ستھرا، پُرامن اور پُرسکون ہوگا۔

ہم نے مغرب کی اندھی نقالی میں اپنے اخلاقی سرمایے کو ایک طرف لپیٹ کر رکھ دیا ہے اور ہر ہر شعبے میں مغربی اخلاق و اقدار کے منفی پہلوؤں کو عالم گیریت کے نام پر سینے سے لگا لیا ہے۔ چنانچہ مغرب کی پابندیِ وقت، محنت کرنے کی عادت، عوام کو جواب دہی، عدالتوں میں قانون کی بالادستی جیسی عادات کی جگہ مغربی فحاشی، آزادی کے نام پر احترام اور تقدس کو تار تار کرنا، مساوات کے نام پر خواتین کا استحصال اور انھیں ایک معاشی کھلونا بنا دینا، دین کی جامع تعلیمات کی جگہ اسلام کو مذہب قرار دینا اور پھر مذہب کو تمام معاشرتی، ثقافتی، تعلیمی، معاشی، سیاسی اور قانونی

معاملات سے خارج کرنے کو ترقی پسندی کا نام دے دیا ہے۔

اسلام کے اعلیٰ اخلاقی نظام کی جگہ ہم نے لادینی مفاد پرست اخلاقیات کو ہر سطح پر رائج کرنے کے لیے اپنے ابلاغِ عامہ کو بداخلاقی کے ہراول دستے کا مقام عطا کر دیا ہے۔ ہمارا ابلاغِ عامہ ملک سے مایوسی، ملک کے محافظوں سے نفرت، ملک کی اخلاقی اقدار کی جگہ ہندوانہ ثقافت کو رائج کرنے میں پیش پیش ہے، اور ہر وہ بُرائی جو سرحد پار کے معاشرے میں رائج ہوا سے مزید بدتر شکل میں ہمارے ہاں متعارف کرانے میں مصروف ہے۔

اس غیر اخلاقی عمل کو ہم نے 'ابلاغِ عامہ کی آزادی' کے خوش کن نعرے کی شکل دی ہے اور آزادیِ اظہار کی ایک نئی تعریف ایجاد کی ہے جس کے نتائج معاشرے میں جابجا نظر آرہے ہیں۔

رواداری اور برداشت : اسلامی حکمت عملی

ہر وہ معاشرہ جو اسلامی تصور صبر، قناعت، مسابقت فی الخیرات، اخوت، قربانی اور تعاون علی البر کی جگہ درآمد کیے ہوئے ہندوانہ یا مغربی تصورات و اقدار کو اختیار کرے گا، اس میں معاشرتی توڑ پھوڑ کا عمل فطری طور پر ہوگا اور قوتِ برداشت کی جگہ فوری فائدے کے حصول کی نفسیات کارفرما ہوگی۔

قرآن وسنت کا دیا ہوا حل نہ صرف آسان ہے بلکہ انتہائی عملی ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے کے لیے اس نے جو حکمت عملی دی ہے ہم نے اسے اپنی ناسمجھی کی بنا پر پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اسلام کا یہ حل نہ وقت میں قید ہے نہ مکان میں بلکہ ہر دور میں اور ہر مقام پر یکساں قابلِ عمل ہے۔ اس حکمت عملی کے چند نمایاں پہلو یہ ہیں:

- **فرد میں اعتدال: توازن اور عدل کا رویہ:** قرآن کریم کا ہر فرمان ایک فرد، خاندان، معاشرے اور ریاست ہر سطح پر امن و سکون پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ ہمیں اسے گھر، تعلیم گاہ اور معاشرے میں متعارف کرانا ہوگا۔

قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیمات میں توحید کے بعد سب سے اہم تعلیم، عدل، توازن اور اعمال کو جیسا کہ اس کا حق ہے ادا کرنے کی ہے۔ "اے لوگو، جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور عدل کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ

توازن سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ تقویٰ کی روش سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے“ (المائدہ ۵:۸)۔ یہ عدل انسان کے ذاتی، خاندانی، معاشرتی اور بین الانسانی معاملات میں خوب صورتی اور حُسن پیدا کرتا ہے اور اس عدل کی کمی، ظلم، استحصال اور ناانصافی کو پیدا کرتی ہے۔ اس لیے عدل کے بغیر کسی معاشرے میں بھلائی اور اصلاح نہیں ہوسکتی۔ معاشی بدحالی سے زیادہ عدل کا فقدان تباہی کا باعث بنتا ہے۔

● **معاشرتی حقوق کی ادایگی:** وہ حقوق والدین کے ہوں یا بیوی اور بچوں اور پڑوسیوں کے، ہمیں انھیں اولیت دینا ہے اور مغربی انفرادیت کے خول سے نکل کر اسلام کے اجتماعیت کے تصور کو اختیار کرنا ہے۔ اسلام ایک جامع اجتماعی نظام ہے، یہ محض ایک فرد کی انفرادی اصلاح کا نسخہ نہیں ہے۔ حقوق کی ادایگی باہمی رواداری، اخوت کو پروان چڑھانے اور طبقاتی نظام سے نجات کا ذریعہ بنے گی۔ فقرا و مساکین کی ضروریات کا پورا کرنا کوئی ’خیراتی‘ کام نہیں ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی فریضہ ہے۔ اس لیے فرمایا گیا: وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات ۵۱:۱۹) یعنی ”تمھارے اموال میں سائل اور محروم کا حق ہے“۔

مسلمان کے مسلمان پر حقوق کو تعلیم گاہوں، دفتروں، تجارتی مراکز، غرض ہر مقام پر تعلیمی اور دیگر ذرائع کا استعمال کر کے ان حقوق کی آگاہی اور ان پر عمل کو ضابطہ بنانا ہوگا۔ اس سلسلے میں جو کم از کم عملی کام کرنے ہوں گے وہ اختصار سے درج ذیل ہیں:

● **غصہ پر قابو:** یہ وہ شیطانی عمل ہے جو ایک انسان کو چند لمحات کے لیے عقل و دانش کی جگہ انتقام اور زیادتی کی طرف لے جاتا ہے۔ ارشاد رحمۃ للعالمینؐ ہے: ”جو (خلافِ حق بولنے سے) اپنی زبان کی حفاظت کرے گا، اللہ اس کے عیب پر پردہ ڈالے گا، اور جو اپنے غصّے کو روکے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن عذاب کو اس سے ہٹائے گا، اور جو خدا سے معافی مانگے گا خدا اس کو معاف کردے گا“۔ (عن انسؓ، مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا: ”اے میرے رب! آپ کے نزدیک آپ کے بندوں میں سے کون سب سے پیارا ہے؟“

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وہ جو انتقامی کارروائی کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کردے“۔ (عن ابوہریرہؓ، مشکوٰۃ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''طاقت ور وہ شخص نہیں ہے جو کُشتی میں دوسروں کو پچھاڑ دیتا ہے بلکہ طاقت ور تو درحقیقت وہ ہے جو غصے کے موقعے پر اپنے اُوپر قابو رکھتا ہے (یعنی غصے میں آکر کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو اللہ اور رسولؐ کو ناپسند ہو)۔(عن ابوہریرہؓ، بخاری)

● **جھوٹ سے نجات**: ہر وہ شے جھوٹ ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے گئے معاہدۂ اطاعت و فرماں برداری سے ٹکراتی ہو۔ ایفاے عہد، خوش کلامی، عفو و درگزر، امانت داری یہ وہ احکامات ہیں جن کے خلاف کوئی عمل کرنا جھوٹ پر عمل کرنا ہے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ''چار خصلتیں جس شخص میں ہوں گی وہ پکا منافق ہوگا اور جس شخص کے اندر ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ اس کو ترک کردے۔ وہ چار خصلتیں یہ ہیں: جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے، اور جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جب کسی سے اس کا جھگڑا ہو جائے تو گالی پر اُتر آئے''۔(عن عبداللہ بن عمروؓ، بخاری، مسلم)

● **تعلقات کی اصلاح اور دوغلے پن سے نجات**: ہمارے معاشرے میں دوعملی اور دوُرخاپن ایک بیماری کی شکل اختیار کرگیا ہے جو آخرکار تشدد وٹکراؤ کا باعث بنتا ہے۔ ہمیں دوُرخے پن کو ختم کر کے اخلاص اور بھلائی کی تلقین کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جو شخص دنیا میں دوُرخاپن اختیار کرے گا تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی''۔(عن عمارؓ، ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم قیامت کے دن بدترین آدمی اُس شخص کو پاؤ گے جو دنیا میں دو چہرے رکھتا تھا۔ کچھ لوگوں سے ایک چہرے کے ساتھ ملتا تھا اور دوسرے لوگوں سے دوسرے چہرے کے ساتھ''۔(متفق علیہ)

● **صوبائی، قبائلی، سیاسی عصبیت**: ظلم اور عدم رواداری کا ایک بڑا سبب برائی کا دفاع، اپنی برادری یا قبیلے کا ساتھ دینے کی بنا پر کرنا ہے۔ یہ ایک عظیم گناہ اور معاشرتی بگاڑ کا ایک بڑا سبب ہے۔ جو شخص اس مرض میں گرفتار ہو اس کی آنکھ وہی دیکھتی ہے جو اس کی برادری، قبیلہ یا جماعت اسے دکھائے۔

ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرض کی نشان دہی یوں فرمائی: ''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے، اور وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے، اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی حالت میں مرے''۔ (عن جبیر بن مطعمؓ، ابوداؤد)

راوی کہتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ''اپنے لوگوں سے محبت کرنا کیا عصبیت ہے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم کے معاملے میں اپنی قوم کا ساتھ دے''۔ (عن ابونسیلہؓ، مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص (کسی ناجائز معاملے میں) اپنی قوم کی مدد کرتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی اُونٹ کنویں میں گر رہا ہو اور یہ اس کی دُم پکڑ کر لٹک گیا ہو تو یہ بھی اس کے ساتھ جا گرا''۔ (عن ابن مسعودؓ، ابوداؤد)

● **جھوٹی گواہی**: ہم اکثر اپنی وابستگیوں اور تعلقات کے اتنے غلام ہو جاتے ہیں کہ عدل اور حق ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ لسانی عصبیت ہو یا قبائلی اور نسلی عصبیت ان بتوں کو پوجنے کے لیے ہم ایسی اصطلاحات ایجاد کر لیتے ہیں جو ہمیں محبت کے نام پر نفرتوں کو پھیلانے کی آزادی دے دیں۔

کسی طاغوتی طاقت کو امن وسلامتی کا رکھوالا سمجھنا، کسی سودی قرض دینے والے ادارے کی ہر طرح کی شرائط تسلیم کر کے قوم کو قرض کے بوجھ تلے دبا دینا، کسی نام نہاد عالمی ادارے کو خوش کرنے کے لیے اسلامی شریعت کے منافی دستوری ترمیمات کے ذریعے شرعی احکام کو پامال کرنا، اپنے ذاتی مفاد اور معاشی فائدے کے لیے قومی مفاد کو پسِ پشت ڈال دینا ___ یہ سب معاملات شہادت زور (جھوٹی گواہی) کی تعریف میں آتے ہیں اور جب تک ان سے توبۃ النصوح نہ کی جائے اور ان کی طرف پھر کبھی رُخ نہ کیا جائے اس وقت تک معاشرے میں امن وسکون، رواداری اور اخوت ومحبت پیدا نہیں ہو سکتی۔

آج شہادت زور ٹی وی اسکرین پر ہو یا عدالت میں یا کسی عظیم الشان اجتماع میں، اسے ایک فنکارانہ صلاحیت اور چابک دستی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی اصلاح کے بغیر معاشرہ اور فرد بھلائی اور سکون حاصل نہیں کر سکتا۔ شارعِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرض کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

''خریم بن فاتکؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی اور جب لوگوں کی طرف رُخ پھیرا تو بیٹھے رہنے کے بجائے آپؐ سیدھے کھڑے ہوگئے اور تین بار فرمایا:۔ ''جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا دونوں برابر کے گناہ ہیں''۔(ابوداؤد)

پھر آپؐ نے پڑھا: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ (تو تم ناپاکی یعنی بتوں سے دُور رہو اور جھوٹی بات کہنے سے دُور رہو اور خدا کے لیے یک سُو ہو جاؤ، شرک چھوڑ کر توحید اختیار کرو)۔

شہادتِ زور کو الرجس قرار دینا خود اس کے گھناؤنا ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ جھوٹی گواہی محض عدالتوں میں نہیں بلکہ ایمان کے دعوے کے بعد نماز کی ادایگی نہ کرنا، زکوٰۃ کا ادا نہ کرنا، ظلم ہوتے ہوئے دیکھ کر خاموش رہنا، طاغوتی قوتوں کے خلاف کلمۂ حق بلند نہ کرنا غرض زندگی کے تمام معاملات میں اس اہم تعلیم کا دخل ہے۔ اسلامی شخصیت کی تعمیر اسی وقت ہوسکتی ہے جب شہادتِ زور سے مکمل طور پر نجات حاصل کی جائے۔

● **افواہوں کی سرکوبی**: آج آزادیِ صحافت اور آزادیِ راے کے نام پر جس بے دردی کے ساتھ حقائق کا گلا کُند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ بن گیا ہے۔ یہ افواہیں بُرائی کے فروغ اور ظلم و استحصال کے لیے سازگار فضا پیدا کرتی ہیں اور لوگوں کو ورغلا کر سڑکوں پر آ کر توڑ پھوڑ اور معصوم شہریوں کی اِملاک کو نقصان پہنچانے پر اُبھارتی ہیں۔ اس فتنے کی اصلاح بلاتاخیر کرنی ہوگی۔ دین کی حکمت کو قیامت تک سب سے زیادہ سمجھنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ''شیطان آدمی کے بھیس میں کام کرتا ہے، وہ لوگوں کے پاس آ کر جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے۔ پھر لوگ جدا ہو جاتے ہیں (یعنی مجلس ختم ہو جاتی ہے اور یہ لوگ منتشر ہو جاتے ہیں) تو ان میں سے ایک آدمی کہتا ہے کہ مَیں نے یہ بات ایک آدمی سے سنی ہے جس کا چہرہ تو مَیں پہچانتا ہوں لیکن نام نہیں جانتا''۔(عن ابن مسعودؓ، مسلم)

● **خیرخواہی اور حق گوئی**: معاشرے کے ہر کلمہ گو فرد کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے اصلاح اور نیکی کے قیام کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو انجام دینا ہوگا۔ وہ افراد جو اپنے آپ کو اسلامی تحریک سے وابستہ سمجھتے ہوں ان پر یہ فریضہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ہر ہر سطح پر اپنے ہاتھ، اپنی زبان اور اپنے دل

کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور خیر خواہی اور نصیحت کے فریضے کو انجام دیں۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''دین خلوص و خیر خواہی کا نام ہے''۔ یہ بات آپؐ نے تین دفعہ فرمائی۔ صحابہؓ نے عرض کیا: کس کے لیے خلوص اور خیر خواہی؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، مسلمانوں کے اجتماعی نظام کے سربراہوں کے لیے، اور عام اہلِ اسلام کے لیے''۔ (عن تمیم داریؓ، مسلم)

خلوصِ نیت سے اصلاحِ احوال کے لیے بھلائی کا مشورہ دینا، امر بالمعروف کرنا اور اس مشورے میں کوئی تخصیص نہ کرنا دین کا تقاضا ہے۔ یہ نصیحت ہر ہر سطح پر کرنی ہوگی۔ وہ ایوانِ اقتدار ہو یا کسی تحریک کا نظم، وہ عام کارکن ہوں یا مرکزی ذمہ داران، اس سے کسی کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک یہ پُرخلوص تنقید ہوتی رہے گی ادارے، تحریکات اور ملک کے سربراہان راہِ راست پر رہیں گے۔ جب مصلحت، بزرگی اور منصب کے احترام کی بنا پر حق بات کا نہ کہنا عام ہو جائے تو پھر نہ کوئی ادارہ، نہ کوئی گھر، نہ کوئی جماعت اور نہ کوئی ملک صحیح خطوط پر ترقی کرسکتا ہے۔

● **تعلق باللہ:** دین کے تمام معاملات کا انحصار تعلّق باللہ پر ہے۔ اس لیے امر بالمعروف اور نصیحت ہو یا افواہوں کو رد کرتے ہوئے حق کی گواہی دینے کا مرحلہ، تحریک کے اندر کسی کمزوری کی نشان دہی اور خلوصِ نیت کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش ہو یا احتسابِ نفس اور ذمہ داران کا احتساب، ہر ہر عمل کی بنیاد تعلّق باللہ پر ہے۔ جتنا ہمارا تعلّق اپنے رب سے، اس کے بھیجے ہوئے کلامِ قرآنِ مجید اور اس کے مقرر کردہ ہادی اعظمؐ اور خاتم النبیینؐ سے انتہائی قریبی نہیں ہوگا، ہماری کوئی کوشش بارآور نہیں ہوسکتی۔ ربِ کریم کا وعدہ ہے اور اس کا ہر وعدہ حق ہوتا ہے کہ جب اہلِ ایمان اللہ کو رب مان کر اس پر استقامت سے جم جاتے ہیں اور کسی اور کی حاکمیت ماننے کو تیار نہیں ہوتے، تو وہ اَن دیکھی قوتوں سے ان کی نصرت کرتا ہے اور کامیابی کو ان کا مقدر بنا دیتا ہے۔

معاشرہ، خاندان اور ریاست سے تشدد کا خاتمہ مزید تشدد سے نہیں دین کی حکمت اور دین کی واضح تعلیمات کے نفاذ ہی سے ہوسکتا ہے۔ عدل کا قیام، سچّائی کا فروغ اور امانتوں کا ان کے اہل افراد کے سپرد کرنا کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔

بڑی تبدیلی لائیے!

انسانی زندگی تبدیلی اور تغیّر کے مسلسل عمل سے گزر رہی ہے۔ کچھ تبدیلیاں ارادے کے نتیجے میں آتی ہیں، جب کہ کچھ حالات کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ کچھ پسندیدہ ہوتی ہیں اور خوش گوار بھی، جب کہ کچھ تلخی اور سختیوں کے ساتھ رُونما ہوتی ہیں۔ بعض تو بارہا سوچنے اور ارادہ کرنے کے باوجود نہیں آتی ہیں۔

بعض بڑے کاموں کے کوئی اثرات نہیں ہوتے، سوائے وقت اور وسائل کے ضیاع کے...... اور چھوٹے کام توجہ ہی نہیں حاصل کرپاتے۔ اکثر بڑے کاروبار، بڑی جماعتیں آغاز میں کسی ایک فرد کے عمل سے شروع ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ بڑی تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے؟

- سوچ بلند اور مقاصد عظیم رکھیں۔
- ارادے کی قوت پر قدغن نہ لگائیں۔
- اپنا جائزہ، اپنے اندر رہ کر اور باہر سے دیکھ کر لیں۔
- جب سوچیں تو تازہ اور ازسرِنو انداز میں سوچیں۔
- چھوٹے کام کو حقیر نہ سمجھیں، بڑے کو ناممکن نہ سمجھیں۔
- اندھادھند کوشش کرنے کے بجاے، منفعت بخش محنت کریں۔
- نئی شکل اور نئی حیثیت کا اِدراک مستقبل کی روشنی میں کریں۔
- جو کرسکتے ہوں، اس کو، جو نہ کرسکتے ہوں، کی وجہ سے ملتوی نہ کریں۔
- اندرونی تبدیلی کو ظاہر کی تبدیلی پر ترجیح دیں۔
- بڑی تبدیلیاں چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے نتیجے میں آتی ہیں، لہٰذا چھوٹی تبدیلیوں کے لیے زیادہ محنت کریں۔

سنابل العلم

مسئلہ فلسطین کا حل

[مسئلہ فلسطین] کی پوری نوعیت، نزاکت اور اہمیّت اچھی طرح سمجھ [لینے کے بعد] چند باتیں بخوبی واضح ہوجاتی ہیں:

اول: یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار بنی رہی ہیں اور اُن کی اس روش میں آیندہ بھی کسی تغیّر کے امکانات نظر نہیں آتے، خصوصاً امریکا کی پُشت پناہی جب تک اسے حاصل ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے جرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔

دوم: یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی اُمید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطرہ مول نہ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔

سوم: یہ کہ اقوامِ متحدہ ریزولیوشن پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کرسکتی۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی مجرمانہ اقدام سے روک سکے۔

چہارم: یہ کہ عرب ممالک کی طاقت اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ پچھلے ۲۲ سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کردی ہے۔

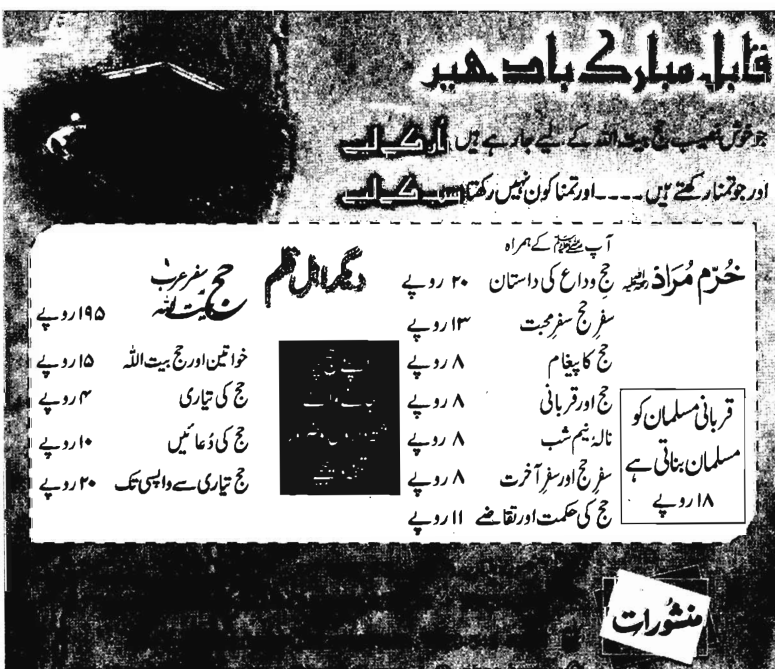
ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مسجدِ اقصیٰ، بلکہ مدینہ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت اس یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کو مستقل طور پر محفوظ کردینے کے لیے مجتمع کی جائے۔ اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔ دنیا کے مسلمان ایک مدت سے کہتے رہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا

مسئلہ ہے مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں، یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مسجد اقصیٰ کے سانحے سے ان کی آنکھیں بھی کھل گئی ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ صہیونیت کی عظیم بین الاقوامی سازش کا مقابلہ، جب کہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید وحمایت بھی اس کو حاصل ہے، تنہا عربوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ دنیا میں اگر ایک کروڑ ۶۰ لاکھ یہودی ایک طاقت ہیں تو ۷۰، ۷۵ کروڑ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں، اور ان کی ۳۰-۳۲ حکومتیں اس وقت انڈونیشیا سے مراکو اور مغربی افریقہ تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور روے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس مسئلے کو حل کر لینا، ان شاء اللہ کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجد اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے، اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اور اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلان بالفور سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں، باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں انھیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور جبر وظلم کے ذریعے سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا قومی وطن بنایا، پھر اسے قومی ریاست میں تبدیل کیا، اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی ایک کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجاے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے اور عالمِ اسلامی کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ اس کے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا، اس کو ختم ہونا چاہیے۔ فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بننی چاہیے جس میں ملک کے پُرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور

عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں، اور باہر سے آئے ہوئے اُن غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو قومی وطن اور پھر قومی ریاست بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکا، جو اپنا ضمیر یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر، اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالاے طاق رکھ کر ان غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے، تو اب وقت آ گیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کو صاف صاف خبردار کر دیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو روے زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اُس کے لیے کوئی ادنیٰ درجے کا بھی جذبۂ خیرسگالی باقی رہ جائے۔ اب وہ خود فیصلہ کر لے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔ (سانحۂ مسجد اقصیٰ، ص ۱۸-۲۰، ناشر: ادارہ ترجمان القرآن، لاہور)



اہلِ خانہ کے ساتھ جنت میں......!

اخذ و ترتیب: سعادت محمود

ہمارے رب نے اپنے کلام پاک میں بہت سے مناظر کا نقشہ کھینچا ہے۔ اُن میں سے ایک دل کش اور خوب صورت منظر، اہل خانہ کے ساتھ جنت میں داخلے کا ہے۔ کیا میں نے اور آپ نے کبھی، اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ، جنت میں، وہاں کی حقیقی مسرتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لُطف اندوز ہونے کے اس خوب صورت منظر کا تصور کرنے کی کوشش کی ہے!

اللہ سُبحانہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''(عقل رکھنے والے لوگ) اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اُسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑنہیں ڈالتے۔ اُن کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انھیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے۔ اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انھی لوگوں کے لیے ہے۔

(اُن کے لیے) دائمی (ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) رہایش کے باغات ہوں گے۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور اُن کے آباواجداد اور اُن کی بیویوں اور اُن کی اولاد میں سے جو جو صالح ہوں گے وہ بھی اُن کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے اُن کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے کہ: ''تم پر سلامتی ہے، تم نے دنیا میں جس طرح صبر (دین پر استقامت) سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس (جنت) کے مستحق ہوئے ہو ___ پس کیا ہی

خوب ہے یہ آخرت کا گھر!'' (الرعد ۱۳: ۲۰-۲۴)

درجِ بالا آیت کی روشنی میں تصور کریں کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ ہمیں ہمارے نیک اعمال کی وجہ سے یہ اعزاز بخشے کہ ہمیں اور ہمارے تمام اہلِ خانہ کو جنت کے اعلیٰ درجات تک پہنچا دے۔

ہم سوچیں کہ کیا ہم نے کبھی، اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ، جنت میں، وہاں کی حقیقی مسرّتوں سے ہمیشہ کے لیے لُطف اندوز ہونے کے اس مقام کو پانے کی تمنا کی ہے!

یہ وہ مقام ہے جس کے لیے فرشتے بھی ہمارے لیے دُعا کرتے ہیں۔

سورۂ مومن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد وپیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دُعاے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''اے ہمارے رب! تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، پس معاف کر دے اور عذابِ دوزخ سے بچا لے اُن لوگوں کو جنھوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب اور داخل کر، اُن کو ہمیشہ رہنے والی اُن جنتوں میں جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا ہے، اور اُن کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (اُن کو بھی وہاں اُن کے ساتھ پہنچا دے)۔ تو بلاشبہہ قادرِ مطلق اور حکیم ہے۔ بچا دے اُن کو بُرائیوں سے۔ جس کو تو نے قیامت کے دن بُرائیوں سے بچا دیا اُس پر تو نے بڑا رحم کیا، یہی بڑی کامیابی ہے''۔ (۴۰: ۷-۹)

اس آیت کی تشریح میں صاحبِ تفہیم القرآن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھتے ہیں: یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں (اور قیامت تک حضوؐر اور ان کے صحابہؓ کے نقشِ قدم پر چلنے والوں) کی تسلّی کے لیے ارشاد ہوئی ہے۔ وہ اس وقت کفّارِ مکّہ کی زبان درازیوں اور چیرہ دستیوں اور ان کے مقابلے میں اپنی بے بسی دیکھ دیکھ کر سخت دل شکستہ ہو رہے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ ان گھٹیا اور رذیل لوگوں کی باتوں پر تم رنجیدہ کیوں ہوتے ہو، تمھارا مرتبہ تو وہ ہے کہ عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے اور عرش کے گرد وپیش حاضر رہنے والے ملائکہ تک تمھارے حامی ہیں اور تمھارے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور سفارشیں کر رہے ہیں۔ عام فرشتوں کے بجاے عرشِ الٰہی کے حامل اور اس کے گرد وپیش حاضر رہنے والے فرشتوں کا ذکر یہ تصور دلانے کے لیے کیا گیا ہے کہ

سلطنتِ خداوندی کے عام اہل کار تو درکنار، وہ ملائکہ مقربین بھی جو اس سلطنت کے ستون ہیں اور جنھیں فرماں روائے کائنات کے ہاں قرب کا مقام حاصل ہے، تمھارے ساتھ گہری دل چسپی و ہمدردی رکھتے ہیں''۔ (تفہیم القرآن، جلد۴، ص ۳۹۴)

درجِ بالا دونوں آیات میں اہلِ ایمان کے والدین، بیویوں اور اولاد میں سے اُن کے لیے جنت کا وعدہ اور اور فرشتوں کی دُعا کا ذکر ہے، جو ان میں سے صالح ہوں۔ لیکن سورۃ الطّور میں مزید رعایت دی گئی ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ اگر اُن کی اولاد کسی نہ کسی درجۂ ایمان میں بھی اپنے آبا کے نقشِ قدم کی پیروی کرتی رہی ہو، تو اپنے عمل کے لحاظ سے خواہ وہ اُس مرتبے کی مستحق نہ ہو جو ان کے آبا کو ان کے بہتر ایمان و عمل کی بنا پر حاصل ہوگا، پھر بھی یہ اولاد اپنے آبا کے ساتھ ملا دی جائے گی۔ یقیناً یہ اہلِ ایمان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

ارشادِ رب کریم ہے: متقی لوگ وہاں باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے، لُطف لے رہے ہوں گے جو اُن کا رب اُنھیں دے گا، اور اُن کا رب اُنھیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے گا۔ (اُن سے کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوب صورت آنکھوں والی حوریں اُن سے بیاہ دیں گے۔

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اُن کی اولاد بھی کسی درجۂ ایمان میں اُن کے نقشِ قدم پر چلی ہے اُن کی اُس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) اُن کے ساتھ ملا دیں گے اور اُن کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔ ہم اُن کو ہر طرح کے پھل اور گوشت، جس چیز کو بھی ان کا جی چاہے گا، خوب دیے چلے جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے جامِ شراب لپک لپک کر لے رہے ہوں گے جس میں نہ یاوہ گوئی ہوگی نہ بدکرداری۔ اور اُن کی خدمت میں وہ لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو اُنھی (کی خدمت) کے لیے مخصوص ہوں گے، ایسے خوب صورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔

یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے (دنیا میں گزرے ہوئے) حالات پوچھیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں (اللہ سے) ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے۔ آخرکار

اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جُھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا۔ ہم پچھلی زندگی میں اُسی سے دعائیں مانگتے تھے، وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے''۔(الطور ۱۷:۲۸)

کیا ہم نے کبھی، اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ، جنت میں، وہاں کی حقیقی مسرّتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لُطف اندوز ہونے کا یہ مقام حاصل کرنے کی کوشش اور اس کے لیے کوئی منصوبہ بندی کی ہے؟

آیت ۱۷ میں جنت میں داخلے کے ساتھ دوزخ کے عذاب سے بچائے جانے کا ذکر ہے۔ اس کی تشریح میں صاحب تفہیم القرآن سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے: ''کسی شخص کے داخلِ جنت ہونے کا ذکر کر دینے کے بعد پھر دوزخ سے اس کے بچائے جانے کا ذکر کرنے کی بظاہر کوئی حاجت نہیں رہتی۔ مگر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ دونوں باتیں الگ الگ اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ آدمی کا دوزخ سے بچ جانا بجاے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اور یہ ارشاد کہ ''اللہ نے ان کو عذابِ دوزخ سے بچالیا'' دراصل اشارہ ہے اِس حقیقت کی طرف کہ آدمی کا دوزخ سے بچ جانا اللہ کے فضل و کرم ہی سے ممکن ہے، ورنہ بشری کمزوریاں ہر شخص کے عمل میں ایسی ایسی خامیاں پیدا کر دیتی ہیں کہ اگر اللہ اپنی فیاضی سے اُن کو نظر انداز نہ فرمائے، اور سخت محاسبے پر اُتر آئے تو کوئی بھی گرفت سے نہیں چھوٹ سکتا۔ اسی لیے جنت میں داخل ہونا اللہ کی جتنی بڑی نعمت ہے اُس سے کچھ کم نعمت یہ نہیں ہے کہ آدمی دوزخ سے بچالیا جائے''۔(تفہیم القرآن، جلد۵، ص ۱۶۷)

آیت ۱۹ میں فرمایا: ''کھاؤ اور پیو مزے سے'' اس 'مزے' کی تشریح بھی صاحب تفہیم القرآن نے کی ہے: ''یہاں 'مزے سے' کا لفظ اپنے اندر بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ جنت میں انسان کو جو کچھ ملے گا کسی مشقت اور محنت کے بغیر ملے گا۔ اُس کے ختم ہو جانے یا اُس کے اندر کمی واقع ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ اُس کے لیے انسان کو کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ عین اُس کی خواہش اور اس کے دل کی پسند کے مطابق ہوگا۔ جتنا چاہے گا اور جب چاہے گا حاضر کر دیا جائے گا۔ مہمان کے طور پر وہ وہاں مقیم نہ ہوگا کہ کچھ طلب کرتے ہوئے شرمائے بلکہ سب کچھ اُس کے اپنے گذشتہ اعمال کا صلہ اور اُس کی اپنی پچھلی کمائی کا ثمر ہوگا۔ اُس کے کھانے اور پینے سے کسی مرض کا خطرہ بھی نہ ہوگا۔ وہ بھوک مٹانے اور زندہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ صرف لذّت حاصل کرنے کے لیے ہوگا۔ اور آدمی جتنی لذّت بھی اُس سے اُٹھانا چاہے، اُٹھا سکے گا بغیر اس کے کہ اس سے کوئی سوءِ ہضم

لاحق ہو اور وہ غذا کسی قسم کی غلاظت پیدا کرنے والی بھی نہ ہوگی۔ اس لیے دنیا میں ’مزے‘ سے کھانے پینے کا جو مفہوم ہے، جنت میں ’مزے‘ سے کھانے پینے کا مفہوم اس سے بدرجہا زیادہ وسیع اور اعلیٰ وارفع ہے“۔ (تفہیم القرآن، جلد۵، ص ۱۶۸)

یہاں اُس حدیث کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے حضورؐ نے بیان فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: میں نے اپنے نیک اور صالح بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے اُن کا ذکر سنا ہے اور نہ کسی بشر کے دل میں کبھی اُن کا خیال ہی آیا ہے۔ اگر تم چاہو تو قرآن کی آیت پڑھو: ”پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لیا چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے“۔ (السجدہ ۳۲:۱۷)

آیئے! ہم اپنے آپ کو اور اپنے اہلِ خانہ کو دوزخ کے عذاب سے بچا کر انھیں جنت کے اعلیٰ مقام تک لے جانے کے لیے کمربستہ ہو جائیں، اور اُس کے لیے کوشش اور جدوجہد شروع کر دیں۔

حج کا پیغام

خرم مرادؒ

مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں پہلا وہ گھر خدا کا، جس کے گرد ان دنوں عشاقِ بے تاب کا ایک ہجوم بے پناہ دُنیا کے گوشے گوشے سے کھنچ کھنچ کر پروانہ وار جمع ہو رہا ہے، اور ہزاروں برس سے ہوتا چلا آ رہا ہے، ہمارے لیے مرکز زندگی کا مقام رکھتا ہے۔ اس گھر کی غریب و سادہ رنگین داستان کے ورق ورق پر آیات بینات کا ایک اتھاہ خزانہ رقم ہے۔ ان آیات میں دیدہ و دل وا کرنے کے لیے، راہ زندگی روشن کرنے کے لیے، اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے، بیش بہا دولت محفوظ ہے۔ اس گھر میں وہ زم زم ہی رواں نہیں ہے جو چار ہزار سال سے پیاسوں کی پیاس بجھا رہا ہے اور بجھاتا چلا جائے گا، بلکہ اس ہی سے ہدایت و برکت کا وہ زم زم بھی جاری ہوا ہے جس نے سارے جہانوں کی معنوی تشنگی دور کرنے اور ان کے قلوب و ارواح اور فکر و عمل کی سیرابی کا سامان کیا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، کہ اس ایک گوشۂ مکان کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ خدائے لامکاں کی رحمت کاملہ نے اسیر مکان و زمان کو اپنا تقرب بخشنے کی خاطر اسے اپنا گھر بنا لیا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَo فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ (اٰل عمرٰن ۳:۹۶-۹۷) بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

ان آیات بینات میں سب سے نمایاں، اخلاص و محبت اور اطاعت و وفا کے وہ نقوش ہیں جو اس گھر کے ایک ایک پتھر پر، اور اس کے جوار میں ایک ایک چپے پر، سلسلۂ رشد و ہدایت کے

امام اولیں حضرت ابراہیمؑ نے راہِ خدا میں اپنے مقام عالی سے ثبت کیے ہیں۔ اُنھوں نے رب واحد کی بندگی کی خاطر وطن چھوڑنے کے بعد، اپنی یکہ وتنہا بیوی اور شیر خوار بیٹے کو اس گھر کے جوار میں لا بسایا، انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اس گھر کی دیواریں چنیں، انھوں نے اس گھر کی زیارت کے لیے مشرق و مغرب کو پکارا، انھوں نے اس گھر کو طواف، اعتکاف، قیام اور رکوع و سجود کا مرکز بنایا، یہیں انھوں نے بارگاہِ محبُوب میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی۔ انھوں نے مشیت الٰہی کی طرف سے اس گھر کو سلسلۂ رشد و ہدایت کے امام آخرؐ، اور اُمت مسلمہ کے ظہور کا مبدا ومرکز بنانے کے فیصلے کو، دعا کے رنگ میں، ثبت وظاہر کر دیا۔

پھر اللہ کا یہ گھر، اور یہ البلد الامین ان تمام تابناک و بے مثال روایات کا حامل بھی بن گیا جو بعثت محمدیؐ، نزول قرآن، دعوت اسلامی، اور ہجرت و جہاد کے ابواب میں محفوظ ہیں۔ اس گھر کا کوئی پتھر ایسا نہیں، اس کے قرب میں کوئی چٹان اور سنگ ریزہ ایسا نہیں، جس کے دل میں ہدایت و دعوت اور ہجرت و جہاد کا کوئی نہ کوئی نقش محفوظ نہ ہو، اور جویا و پیاسا اسے پا نہ سکتا ہو۔ سوچیے تو یہ بھی وراثت ابراہیم ہی ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَسَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج ۲۲:۷۸) قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام ''مسلم'' رکھا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو، اور اس شہر کو ایسا جاے امن بنایا کہ جو اس میں داخل ہو جاتا ہے، اس کے جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں، اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر انھوں نے اس گھر میں ہدایت کا جو مرکز قائم کیا، صرف وہ مرکز ہی ایک ایسا مرکز ہے جہاں انسان داخل ہو تو اس کے قلب و روح، فکر وسوچ، اخلاق و کردار، شخصی زندگی اور حیات اجتماعی، سب محفوظ و مامون ہو جاتے ہیں۔ اگر کہیں انسان خوف وحزن، ظلم وفساد، اور دُنیا و آخرت کے بگاڑ اور تباہی سے امن حاصل کر سکتا ہے تو اس بناء ہدایت میں داخل ہو کر جو عالم معنوی میں خانۂ کعبہ کی مثال ہے:

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (اٰل عمرٰن ۳:۹۷) اور اُس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔

صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے یہ ضروری ہوا کہ جو پہنچ سکتا ہو وہ کم سے کم عمر میں ایک دفعہ،

حضرت ابراہیمؑ کی طرح گھر بار ترک کر کے، طویل مسافت طے کر کے، لباس دُنیا اتار کے، اللہ کے اس گھر تک ضرور پہنچے، اور یہاں فیض کا جو چشمہ بہہ رہا ہے اس میں ضرور غوطہ لگائے۔ اس گھر پر وہ اپنے دل کا لنگر ڈال دے، اس کو نگاہوں میں بسالے کہ اس کو دیکھنا بھی عبادت ہے، اس کے چاروں طرف چکر کاٹے، اس کے در و دیوار سے چمٹے، اس کے جوار میں پہاڑیوں پر چڑھے، وادیوں میں چلے اور رب البیت کے دربار عرفات میں حاضر ہو جائے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط (اٰل عمرٰن ۳:۹۷) لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اِس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔

لیکن نہ ہر شخص پہنچ جانے کی استطاعت رکھ سکتا ہے، نہ عمر میں صرف ایک دفعہ ہو آنا اس چشمۂ ہدایت سے فیض مطلوب حاصل کرنے کے لیے کفایت کرتا ہے۔ جو ھُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے اس کے ساتھ تو زندگی کے ہر لمحہ مربوط رہنا ناگزیز ہے۔ چنانچہ یہ بھی ضروری ہوا کہ دُنیا میں جہاں کہیں بھی ہو، اور جس حالت میں بھی ہو، ہر روز پانچ دفعہ، دُنیا کا ہر شغل اور ہر دل چسپی ترک کر کے (جس طرح حج کے لیے کرتے ہو)، اس برکت و ہدایت کے گھر کی طرف رُخ کرو، سامنے اسی گھر کو رکھو، نگاہیں اسی پر جماؤ:

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط (البقرة ۲:۱۴۴) اب جہاں کہیں تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

بیت اللہ کے حج کو جانا، عمر بھر جانے کی آرزو اور شوق میں سلگتے رہنا، گویا کہ اس کو اپنی سعی وطلب کا مقصود بنانا، اور ہر روز پانچ دفعہ اس کی طرف رُخ کر کے اپنے رب کے سامنے جھکنا اور بچھ جانا اور اس سے ہم کلام ہونا، گویا کہ اس کو اپنے دل و نگاہ کا مرکز بنانا، ایسے اعمال ہیں جو ہماری زندگیوں کو رُخ، رنگ اور ساخت عطا کرتے ہیں۔ ان دِنوں جب حج کا موسم ہے اور زائرین اس شمع کے گرد ہجوم کر رہے ہیں، ہمیں آگاہ ہونا چاہیے کہ اس گھر میں، اس کی تاریخ میں، اس کی روایات میں، اس میں ثبت کردہ نقوش و آثار میں، برکت و ہدایت اور آیات بینات کے کیسے کیسے بیش بہا خزانے ہیں جو ہماری جستجو کے منتظر ہیں، اور جن سے ہمیں اپنی جھولی بھرنا چاہیے۔

بر و بحر میں فساد کا تلاطم ہو، ہمارے گھروں میں ظلم اور فتنہ کی طغیانی ہو، اُمت ذلت و مسکنت

کے شکنجے میں کسی ہوئی ہو، اغیار کا غلبہ ہو تسلط ہو، باہمی افتراق وعداوت ہو، خونِ مسلم کی ارزانی اور عزتِ مسلم کی پامالی ہو، اُمت مسلمہ کا احیا مقصود ہو، جس طرح بچے کو ماں کے سینے سے چمٹ کر ہی امن و اطمینان نصیب ہوتا ہے، انسانیت اور اُمتِ مسلمہ کو امن اور فلاح، بیت اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے چمٹ کر ہی نصیب ہو سکتا ہے۔

خدائے لامکاں کسی مکان میں سما نہیں سکتا۔ بیت اللہ تو ایک علامت ہے، ایک شعار ہے، اور اس لیے ہے کہ مرکزِ دل، محبُوبِ نظر، مقصودِ سعی و جہد، اللہ اور صرف اللہ، بن جائے۔ جو اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھام لے، اسی کے ساتھ جڑ جائے، اس طرح تھام لے اور جڑ جائے جس طرح کہ اللہ کا حق ہے، وہی صراطِ مستقیم پالیتا ہے۔

وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۱) جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہِ راست پالے گا۔

ہدایت کوئی لیبل چسپاں کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی، وہ یہودی کا لیبل ہو نصرانی کا، یا محمدی کا۔ نہ ہدایت خانہ کعبہ کا چکر کاٹ آنے سے ملتی ہے، نہ اس کی طرف منہ کر لینے سے۔ ہدایت تو حضرت ابراہیمؑ کی طرح اللہ کا حنیف بندہ بن جانے کا نام ہے، جس میں شرک کی گندگی کا شائبہ تک بھی نہ ہو:

بَلْ مِلَّۃَ اِبْرٰھٖمَ حَنِیْفًا ط وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (البقرہ ۲:۱۳۵) نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔ اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

حضرت ابراہیمؑ حنیف تھے، یعنی وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف اللہ کے بن گئے تھے، اس کے ہو رہے تھے، اور اللہ کے سوا کسی کے نہ رہ گئے تھے۔

انھوں نے ہر ڈوبنے والی چیز کی، اور ماسوا اللہ ہر چیز ڈوبنے والی اور فنا ہونے والی ہے، محبت ترک کر کے، تمام چمکتے دمکتے چاند، سورج اور ستاروں کا طلسم توڑ کے، اپنا اور اپنی زندگی کا رُخ صرف اللہ کی طرف کر لیا تھا، سب سے بڑھ کر صرف اس کی محبت اپنے دل میں بسالی تھی، صرف اس کو طلب و سعی کا مرکز بنا لیا تھا، صرف اسی پر نگاہیں جمادی تھیں، یا یوں کہیے صرف اسی کو اپنی شخصیت اور زندگی کا قبلہ بنا لیا تھا، اور اس رُخ میں، توجہ میں، وابستگی میں، اللہ کے علاوہ اور کوئی رخ

نہ تھا جو شریک ہو۔

انھوں نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے حوالے کر دیا تھا، اور کوئی چیز اس سے بچا کر نہ رکھی تھی ...... اپنے علاقے اور محبتیں، اپنا گھر اور وطن، اپنی بیوی اور بیٹے، اپنی دُنیا اور اپنی متاع...... پرستش بھی اس کی، ہر چیز اس کے اشارے پر حاضر اور قربان بھی، زندگی بھی اسی کی، موت بھی اسی کی۔ اور اس خود سپردگی میں بھی شمہ برابر حصہ اللہ کے علاوہ اور کسی کے لیے نہ لگایا تھا۔

وہ اپنے رب کے ہر حکم کی فرماں برداری کے لیے ہر وقت مستعد اور حاضر تھے۔ آگ میں بے خطر کود پڑنے کا حکم ہو، گھر اور وطن چھوڑ کر نکل جانے کا حکم ہو، باپ کے لیے استغفار تک ترک کر دینے کا حکم ہو، تمام معبُودانِ باطل سے اعلانِ براءت و عداوت کا حکم ہو، اہل و عیال کو وادیِ غیر ذی زرع میں بسانے کا حکم ہو، پتھروں سے اللہ کے گھر کی دیواریں چننے کا حکم ہو، اکلوتے اور محبُوب نورِ نظر کے گلے پر چھری چلانے کا حکم ہو___ ان کی زبان پر ہر وقت لبیک تھا، وہ ہر وقت حاضر تھے، ان کی ہر چیز حاضر تھی۔

توحید خالص، ریاضی کے فارمولے کی طرح، اللہ کو ایک مان لینا نہیں، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح سب کچھ چھوڑ کر صرف اُسی کا بن جانا اور اُسی کا ہو کر رہنا ہے۔ بیت اللہ کی آیات ہدایت میں سب سے نمایاں اور سب سے اہم حضرت ابراہیمؑ کا یہی اسوۂ زندگی ہے جو 'اسلام' اور 'حنیفیت' سے عبارت ہے۔ حج اور استقبالِ قبلہ کا عمل ہمیں بندگیِ رب کے اس رنگ میں رنگنے ہی کے لیے ہے، جس کی شان حضرت ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ نے اپنی توحید خالص، اخلاص و وفاداری، فرماں برداری اور یکسوئی سے قائم کی۔ یہی رنگ اللہ تعالیٰ کو محبُوب ہے، یہی اُس کو مطلوب ہے، یہی اُس کے ہاں مقبول ہے۔ اس رنگ میں رنگ جانے والوں ہی سے وہ راضی ہوتا ہے۔ اِنھی سے دُنیا میں علو و امامت کا وعدہ ہے، اور آخرت میں جنت کے انعام سے سرفرازی کا۔

ہم حج بھی کریں، عمروں کے لیے بھی جائیں، منہ کعبہ شریف کی طرف کر کے نمازیں بھی پڑھیں، مگر ہم پر وہ رنگ نہ چڑھے جو حضرت ابراہیمؑ کا رنگ تھا، تو اس سے بڑھ کر ہماری حرماں نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے، اور جو حرماں نصیبی ہمارا مقدر بن گئی ہے اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہم سے دُنیا میں جو وعدے ہیں ...... استخلاف فی الارض کا وعدہ ہے، غلبۂ دین کا وعدہ ہے،

خوف سے نجات اور امن سے ہم کنار کرنے کا وعدہ ہے...... وہ سب وعدے اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ہم اللہ کے ایسے بندے بن جائیں کہ بندگی اور کسی کے لیے نہ ہو:

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ط (النور ۲۴:۵۵) بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

مشرق سے لے کر مغرب تک نظر ڈال لیجیے! کیا اُمت مسلمہ میں حضرت ابراہیمؑ کا کوئی ایسا رنگ ہے جو غیر مسلموں اور مشرکوں کے رنگ سے الگ ہو۔ اپنے دلوں کو دیکھیے، انھی کی طرح بے شمار ٹکڑوں میں منقسم ہیں اور ہر ٹکڑے میں ایک الگ معبود بیٹھا ہوا ہے۔ اغراض و مقاصد پر نظر ڈالیے، انھی کی طرح وہ بھی ان گنت ہیں اور ان سب سے کم مقام ان کا ہے جو اللہ کے نزدیک محبوب ترین ہیں۔ نماز میں بے شک ہمارا منہ قبلہ کے علاوہ کسی اور طرف نہیں ہوتا، لیکن زندگی میں تو انھی کی طرح ہمارے بہت سے قبلے ہیں جو ہماری توجہات اور وابستگیوں کا مرکز ہیں۔ زبان پر بے شک لبیک ہے، لیکن ہم نہ خود اپنے کو، نہ اپنی کسی محبوب چیز کو، اللہ کے لیے حاضر کرنے کو تیار ہیں۔ ہر حکم کی تعمیل میں ہماری اپنی کسی نہ کسی خواہش، پسند و ناپسند، محبوب و مبغوض کی قربانی دامن گیر ہو جاتی ہے، یا ہزاروں اندیشے اور خوف ہمیں چاروں طرف سے گھیر کر ہماری راہ مسدود کر دیتے ہیں۔ حج ہو یا استقبالِ قبلہ، بے جان مراسمِ عبادت نہ ہمارے قلوب کو بیدار کرتے ہیں، نہ نگاہوں میں پاکیزگی و یکسوئی پیدا کرتے ہیں، نہ عمل میں صالحیت۔ یہ نہ ہماری سوچ بدلتے ہیں، نہ شخصیت، نہ زندگی۔

بیت اللہ کی آیات بینات میں سے یہ بھی ہے کہ ہمہ اقتدار و ہمہ اختیار حی و قیوم خدا، جو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں سے ہے سب کا بلاشرکت غیر مالک کل ہے، اور جس کی کرسی، اقتدار سب کو سمیٹے ہوئے ہے، وہ جب چاہے موت کو زندگی سے، زندگی کو موت سے، اندھیروں کو روشنی سے، روشنی کو اندھیروں سے، عزت کو ذلت سے، اور ذلت کو عزت سے، بدل دیتا ہے۔ جو اس کے ساتھ ایمان اور بندگی کا رشتہ قائم کر لے، اسے ہر اندیشے اور خوف سے، ہر حزن و غم سے، ہر حسرت و یاس سے پاک ہونا چاہیے۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ جب حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو مکہ میں بسانے کے لیے آئے وہاں نہ انسان کا نام و نشان تھا، نہ پانی کا، نہ زراعت کا، نہ

خورد و نوش کا کوئی انتظام، ایک تھیلی (جراب) کھجوروں کی، اور ایک مشکیزہ پانی کا، بس یہ کل کائنات تھی جو وہ ان کے پاس چھوڑ کر چلے۔ حضرت ہاجرہؑ نے بار بار پوچھا کہ ہمیں ایسی وادی میں چھوڑ کر آپ کہاں چلے، جہاں نہ آدم نہ آدم زاد، نہ کوئی اور چیز۔ کوئی جواب نہ پایا تو سوال کیا، کیا اس کا حکم آپ کو اللہ نے دیا ہے؟ فرمایا، ہاں۔ یہ سن کو اطمینان وسکون اور امن کی اس جنت میں داخل ہو گئیں، جس کا باغ ان کے اندر لہلا اُٹھا۔ یہ جنت کیا تھی؟ فرمایا: اِذَنْ لَایُضَیِّعُنَا (پھر تو وہ ہم کو ضائع نہ کرے گا)۔ بخاری کی ایک دوسری روایت کے مطابق، حضرت ہاجرہؑ کے پوچھنے پر ہمیں کس پر چھوڑ کر جارہے ہو، حضرت ابراہیمؑ نے کہا، اللہ پر۔ یہ سن کر وہ پورے سکون واطمینان سے بولیں، رَضِیْتُ بِاللّٰہِ (میں اللہ پر راضی ہوں)۔

اللہ پر یقین اور اعتماد، اللہ پر بھروسا اور توکل، اللہ کے ہر فیصلے پر خوش، بندگیِ رب کی یہ کیفیت تھی کہ ایک یکہ وتنہا عورت اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ، پتھریلے بیابان میں، بھیانک اور ڈراؤنی راتیں، تپتے ہوئے دن، موذی جانور، چور اور ڈاکو، سب کے باوجود، اطمینان اور امن کی کیفیت سے مالا مال تھی۔ معاش کا بندوبست بھی کھجوروں کی ایک تھیلی اور پانی کے مشکیزہ سے زائد کچھ نہ تھا۔ پھر بیت اللہ کی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں کوئی وسائل نہ تھے، کوئی اسباب نہ تھے، کوئی سہارا نہ تھا، صرف خطرات ہی خطرات تھے، وہاں خداے حی و قیوم ۴ ہزار سال سے سب کچھ بخش رہا ہے۔ جہاں کوئی انسان نہ تھا، وہاں لاکھوں انسان دُنیا بھر سے چلے آرہے ہیں۔ جہاں نہ پانی تھا، نہ کھانا، وہاں ہر قسم کا خورد ونوش کا سامان پایا جاتا ہے۔

یہ علم ہو جانے کے بعد، پیغمبرؑ کی زبان سے کہ جس کا علم غیر مشتبہ ہے، کہ یہ خدا کا حکم ہے، کچھ مادی وسائل نہ ہونے کے باوجود، دُنیا بھر میں یکہ وتنہا ہونے کے باوجود، ہر قسم کے سنگین اور مہیب خطرات اور اندیشوں کے سامنے ہوتے ہوئے، اطاعت وفرماں برداری کی راہ چل پڑنا ہی حکمت و دانائی کا راستہ ہے۔ یہی حکمت و دانائی راسخ ہونا چاہیے، اس میں جو چشم سر سے بیت اللہ کو دیکھے، اور پانچ وقت اس کی طرف رخ کرے۔ کیا ہم اغیار کے علم وحکمت سے جھولیاں بھرنے کے بعد، اپنی اس سب سے بیش بہا متاعِ حکمت کو کھو نہیں بیٹھے ہیں؟

حج کے تقریباً سارے ارکان، سعی، جہد اور حرکت پر مشتمل ہیں۔ گھر سے نکلنا، سفر کرنا،

بیت اللہ کے گرد طواف کرنا، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا، مکہ سے نکل کر منیٰ میں ڈیرے ڈالنا، اگلے دن وہاں سے کوچ کر دینا اور عرفات میں جمع ہو جانا، مغرب ہوتے ہی عرفات سے چل دینا، رات کی چند گھڑیاں مزدلفہ میں گزار کر صبح ہی صبح منیٰ واپس پہنچ جانا پھر مکہ جا کر طواف اور سعی کرنا۔

بندگیِ رب کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ اللہ کے ہر حکم اور پکار پر لبیک کہنا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کھڑے ہو جانا، جو کچھ بھی میسر ہو اور جس حالت میں بھی ہو، تعمیل حکم کے لیے نکل پڑنا، اپنی طرف سے کوشش اور جہد میں کوئی کسر نہ چھوڑنا، وسائل زیادہ سے زیادہ جمع کرنا اور ہر ممکن بہتر سے بہتر تدبیر کرنا مگر بھروسا اور نظر صرف تدبیرِ رب پر رکھنا، اور جو کچھ کرنا صرف رب کے لیے کرنا۔

حج میں سارے اعمال، ان صفات کے راسخ کرنے ہی کا کام نہیں کرتے، بلکہ ان اعمال میں حضرت ابراہیمؑ کا اُسوہ کامل بھی برابر تازہ کرتے ہیں، اور اسے نگاہوں کے سامنے لاتے ہیں۔ پتھر کے ایک معمولی سے گھر کو یہ مقام، قبولیت، محبُوبیت اور مرجعیت حاصل ہوئی تو اس میں اس مشن کا بھی دخل تھا جس کے لیے انھوں نے یہ گھر تعمیر کیا اور یہاں اپنی ذریت کو بسایا، اور اخلاص نیت وعمل کو بھی۔ مکان بنوانے والے نے آغاز ہی میں ہدایت کر دی تھی کہ ’’میری بندگی میں کسی کو شریک نہ بنانا‘‘ (الحج)۔ اور میرے گھر کو طواف واعتکاف اور رکوع وسجود کے لیے پاک وآباد رکھنا (البقرہ)۔ انھوں نے اپنے عزائم اور تمناؤں کا اظہار بھی واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا کہ ’’ہماری ذریت بھی تیری فرماں بردار رہے‘‘۔ اس گھر کو بناتے ہوئے جو دُعا لبوں پر جاری تھی وہ صرف رب کے نزدیک قبولیت کی تمناؤں پر مشتمل تھی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (البقرہ ۲:۱۲۷)، اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

اس کے علاوہ نہ کسی کی خوشنودی مطلوب تھی، نہ کسی کے صلہ وانعام پر نظر تھی۔

اس گھر کی آیات میں ایک روشن پیغام سعی کے اس عمل کے اندر بھی ہے جو صفا اور مروہ کے درمیان کی جاتی ہے۔ یہ یادگار ہے اس بھاگ دوڑ کی جو حضرت اسماعیلؑ کو پیاس سے بے تاب دیکھ کر حضرت ہاجرہؓ نے صفا اور مروہ کے درمیان کی۔ کبھی صفا پر چڑھتیں، کبھی بھاگ کر آتیں اور مروہ پر چڑھتیں۔ سعی کا پیغام یہ بھی ہے کہ اللہ کو ہم سے ارادے کے ساتھ ساتھ عملی سعی بھی مطلوب

ہے، عمل اور کوشش بھی مطلوب ہے، اور اسی پر وہ نتائج مرتب فرماتا ہے۔ ''ہر انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے وہ سعی کرے۔'' (النجم)، اور ''جو آخرت کا ارادہ کرے اور اس کے لیے سعی کرے جیسا کہ سعی کرنے کا حق ہے...... اس کی کوشش کی پوری پوری قدردانی کی جائے گی''۔ سعی کا پیغام یہ بھی ہے کہ جب بندہ اپنی بندگی کو اللہ کے لیے خالص کرے، اور حتی المقدور کوشش میں اپنے کو لگا دے، تو اس کا رب اک پتھریلی وادی میں شیرخوار بچے کی ایڑیوں تلے بھی کبھی ختم نہ ہونے والا چشمہ جاری کر دیتا ہے۔

اُمت مسلمہ کی کشتی آج جس قدر بھنور میں پھنسی ہوئی ہے، کیا وہ اس سے اپنے ہمہ اقتدار و اختیار رب پر ابراہیمؑ و ہاجرہؑ کی طرح کلی بھروسا کیے بغیر، اس کی فرماں برداری کی راہ میں ان کی طرح اپنا سب کچھ حاضر کیے بغیر، اور اس راہ میں جان و مال سے سعی و جہد کیے بغیر، نکلنے کی کوئی راہ پا سکتی ہے؟ کیا جس کی نظر کے سامنے ہر روز پانچ مرتبہ بیت اللہ کی آیات بینات کو سامنے لانے کا اہتمام کیا گیا ہو، اس کی نفسیات میں ان سوالوں کی کوئی گنجایش ہوسکتی ہے کہ ایسی خراب قوم کیسے سدھرے گی، ایسے تاریک حالات کیسے بدلیں گے، ایسے بنجر اور سنگلاخ معاشروں میں نیکی کے چشمے کیسے پھوٹیں گے، ایسے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن کیسے اور کہاں سے طلوع ہوگی، جبر واستبداد کی چٹانوں میں سے راستہ کیسے نکلے گا، حقیر کوششیں کیسے رنگ لائیں گی، زبردست طاقتوں کا مقابلہ کیسے ہوگا؟ اگر ایک عورت کا یہ یقین کہ اِذَنْ لَا یُضَیِّعُنَا (پھر اللہ ہم کو ضائع نہ کرے گا)، اور یہ اعلان کہ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ (میں اللہ سے راضی ہوں)، اور اس کی صفا اور مروہ کے درمیان سعی و جہد کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ پتھروں کے ایک معمولی گھر کو یہ مقام عطا کرسکتا ہے، اور سنگلاخ زمین سے زم زم کا چشمہ رواں کرسکتا ہے، تو آج کی دُنیا میں دین کو غلبہ کیوں حاصل نہیں ہوسکتا، اور ظلم وفساد سے بھری ہوئی دُنیا میں نیکی کا چشمہ کیوں نہیں پھوٹ سکتا؟

دینے والا عاجز و درماندہ نہیں، نہ وہ اُونگھ اور نیند کا شکار ہوتا ہے، لینے والے ہی عاجز و درماندہ ہوگئے ہیں، اپنے مقاصد سے اور اپنی قوت و سربلندی کے اصل خزانوں سے غافل ہوکر نیند میں مدہوش ہیں۔ سعی و عمل اور اخلاص و وفا کی جو دُنیا ان سے مطلوب ہے اس کو انھوں نے اپنے ارادہ و اختیار سے باہر سمجھ کر رکھا ہے۔ انسانیت ہدایت کے لیے جاں بلب ہے، فساد کے

بیابان میں زیرِ زمین امن کا چشمہ موجود ہے، مگر یہ دور اپنے ابراہیم کا منتظر ہے۔

حج کا دن تکمیل دین اور اتمام نعمت کی بشارت کا دن بھی ہے۔ اس سے اگلے دن ہی ساری دُنیا کے مسلمان عیدالاضحیٰ کا جشن مناتے ہیں، اور اللہ کے حضور قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ کیا ان کے درمیان ربط کا ادراک بہت مشکل ہے۔ نزول قرآن کے آغاز کے دن، ضبطِ نفس اور تقویٰ، تلاوت قرآن اور قیام اللیل کے ذریعے قربِ الٰہی کے حصول کے لیے، وقف کیے گئے۔ تکمیل دین اور اتمام نعمت کے دن، قربانی اور حبِ الٰہی کے حصول کے لیے مختص کیے گئے۔

تکمیل واتمام بغیر قربانی کے ممکن نہیں، اور قربانی بغیر محبت کے ممکن نہیں۔ اسی لیے حج کے مناسک تمام تر عشق ومحبت پر مشتمل ہیں۔ شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے کو سرگشتہ وشیدا بنا کر، دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وتیرا اختیار کر کے، محبُوب کے گھر کے گرد ننگے پاؤں، اُلجھے ہوئے بال، پریشان حال، گرد میں اٹے ہوئے، سرزمین حجاز میں پہنچیں، اور وہاں پہنچ کر کبھی پہاڑ پر، کبھی زمین پر، محبُوب کے گھر کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں...... اس خانۂ تجلیات کے اردگرد چکر لگائیں، اور اس کے گوشوں کو چومیں چاٹیں۔

اسی محبت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ میں یہ استعداد پیدا ہوئی کہ وہ ہر محبُوب چیز کو اس کے لیے قربان کر دیں جو ایمان لاتے ہی سب سے بڑھ کر محبُوب ہو جاتا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ اور جب محبت کی آخری آزمایش آئی، بیٹے کو قربان کر دینے کے لیے کہا گیا، تو اُنھوں نے بیٹے کے گلے پر بھی چھری رکھ دی۔ جب وہ محبت کی ان ساری آزمایشوں میں پورے اترے (فَاَتَمَّهُنَّ) تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ نعمت بھی تمام کر دی جو دین کی نعمت کے اتمام کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ (البقرہ ۲:۱۲۴) یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں **آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اُتر گیا، تو اُس نے کہا: ''میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔**

جو ایک مکمل دین کے حامل ہونے کا دعویٰ کرتے نہیں جھکتے، ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جب تک وہ محبت کے اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ "کیا کوئی بھی ایسی چیز ایسی ہے جو اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہے؟" اس وقت تک ان کے سروں پر سے امر الٰہی ٹل نہیں سکتا، اور وہ وعدۂ الٰہی کے مستحق ہو نہیں سکتے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق



عشرہ ذی الحجہ...... سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں

حافظ ساجد انور

ذی الحجہ کا پہلا عشرہ عبادات اور اللہ تعالیٰ کی طرف انابت کے حوالے سے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ان ایام میں جہاں ایک طرف حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے والے فقر کے لباس احرام میں ملبوس ہوکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لبیك اللھم لبیك کی صدائیں لگاتے ہیں اور اپنے ایمان کو جلا بخشتے ہیں، وہیں دوسری طرف اس فریضے کی ادایگی نہ کرنے والے اہل ایمان کے لیے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب وتحریص احادیث مطہرہ میں ملتی ہے۔عبادات کی طرف توجہ کے اس پہلو میں ہمیں نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک مخصوص تعداد حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرتی ہے، جب کہ اُمت کی اکثریت اس وقت اس فریضے کی ادایگی نہیں کررہی ہوتی۔ چنانچہ آپؐ کی سیرتِ مطہرہ اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے اسی پہلو کی طرف سب کو متوجہ ہونا چاہیے کہ نفلی عبادات، نوافل، انفاق فی سبیل اللہ، ذکر و اذکار کی طرف خصوصی توجہ کی جائے۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ سے ثابت ہے کہ حج بیت اللہ کا فریضہ آپؐ نے زندگی میں ایک مرتبہ ادا کیا ہے، جب کہ ان دنوں میں عبادات کی ترغیب وتحریص کا خصوصی تذکرہ آپؐ کی سیرتِ مطہرہ میں ملتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نیک اعمال کے حوالے سے ان دنوں سے زیادہ پسندیدہ دن اور کوئی نہیں (اس سے مراد ذی الحجہ کے ابتدائی ۱۰ دن ہیں)۔صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ ! کیا جہاد بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جہاد بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہے الا یہ کہ کوئی شخص اپنی جان اور اپنا مال لے کر اللہ کے راستے

میں جہاد کے لیے نکلے اور واپس کچھ نہ لے کر آئے (یعنی شہادت بھی نصیب ہو اور مال بھی خرچ ہو جائے)۔(بخاری)

ذی الحجہ کے ان ۱۰ دنوں کی فضیلت و اہمیت بیان کی گئی ہے اور احادیث مطہرہ میں ان دنوں میں عبادات کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن بکثرت لوگوں کو جہنم کی آگ سے آزاد کرتے ہیں۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا طلب گار ہونا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ہاں عظمت والا دن یوم النحر (قربانی کا دن) اور یوم عرفہ ہے (احمد ، ابوداؤد، عن عبداللہ بن قرطؓ)۔ آپؐ نے اس دن کی سب سے بہترین دُعا اسے قرار دیا ہے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ، ''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کے لیے بادشاہت اور تعریف ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے''۔

یوم عرفہ کا روزہ

غیر حاجی کے لیے عرفہ کا روزہ رکھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور اس کا عظیم اجر وثواب ذکر کیا گیا ہے۔ آپؐ سے یوم عرفہ کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''یہ روزہ ایک سال اگلے اور ایک سال پچھلے سال کا کفارہ بن جائے گا''۔ (مسلم، عن ابی قتادہؓ)۔ تاہم حاجی کے لیے افضل اور مستحب یہ ہے کہ وہ یوم عرفہ کا روزہ نہ رکھے تاکہ وہ حج کے موقعے پر ذکر، دعا اور دیگر عبادات کا حق ادا کر سکے، اور اسے کمزوری ونقاہت لاحق نہ ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کی سہولت کے پیش نظر خود بھی یوم عرفہ کا روزہ نہیں رکھا۔

حضرت ام فضل بنت الحارث رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس چند لوگ آئے اور عرفہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزے سے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف کرنے لگے۔ بعض نے کہا کہ آپؐ روزے سے ہیں اور بعض نے کہا کہ آپؐ روزہ سے نہیں ہیں۔ میں نے (اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے) آپؐ کی خدمت میں دودھ کا پیالہ بھیجا۔ آپؐ اپنے اُونٹ پر سوار وقوف فرما رہے تھے۔ آپؐ نے دودھ پی لیا (بخاری ، مسلم)۔ عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر اور دعائیں مسنون اور باعث اجر وثواب ہیں۔

یوم النحر: قربانی کا دن

حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے والے جہاں دیگر مناسک حج کی ادائیگی کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کرتے ہیں، وہیں غیر حاجی عام اہل ایمان کے لیے بھی اُن کی عبادت 'نحر' قربانی کے وقت کی فضیلت ہے، اور جانوروں کی قربانی کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اس اہم عبادت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور خشیت وللّٰہیت ہے۔ آج جہاں دیگر عبادات بھی تدریجاً ایک رسم و روایت کی صورت اختیار کرتی جارہی ہیں وہیں قربانی کو بھی نام و نمود اور نمایش کا ذریعہ بنادیا گیا ہے۔

قربانی کی اس اہم عبادت میں شریعت مطہرۃ کے پیش نظر یہ ہے کہ جانور کی قربانی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ۲۲:۳۷) اللہ تعالیٰ تک (قربانی کے جانوروں کا) نہ تو گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون ہی بلکہ اللہ تعالیٰ تک تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

قربانی کے ذریعے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اعزا و اقربا کے لیے صدقہ و انفاق کی کیفیت ہو اور باہم محبت و مودت کے تعلقات کو بڑھایا جائے۔ قربانی کا گوشت خود بھی کھانا مستحب ہے۔ قربانی کے ذریعے شعائر اسلام کا اظہار اور اس کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ قربانی کا یہ عمل حاجیوں کے ساتھ مشابہت کا عمل ہے جس میں ایک گونہ ترغیب اور تشویق کا پہلو بھی غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قربانی کرنے والے کے لیے حاجیوں سے مشابہت کے پیش نظر اپنے بال نہ منڈوانا اور ناخن نہ کتروانا مستحب ہے۔

آزمایشیں

شیخ محمد مراتب النابلسی/ اخذ و ترجمہ: ابوسعد

ہم جس دنیا میں جی رہے ہیں اس کی دو صورتیں ہیں: ایک ظاہری اور دوسری حقیقی۔ دنیا کی حقیقت جاے عبرت اور سراے فانی کی ہے۔ یہ محنت اور جدوجہد کا میدان ہے نہ کہ عیش و آرام کا۔ جس نے اس حقیقت کو جانا، وہ اس دنیا کی آسایش اور فارغ البالی میں مدہوش نہیں رہتا اور نہ دنیا کے مصائب پر غم ہی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ وقتی ہیں، دائمی نہیں، متاع قلیل بھی ہیں اور متاعِ غرور [دھوکا] بھی ؎

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریب سود و زیاں! لا الٰہ الا اللہ (اقبالؔ)

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارالامتحان بنایا ہے اور آخرت کو دارالسلام۔ دنیا کی آزمایش کو آخرت کی جزا و سزا سے جوڑ دیا ہے۔ اللہ جل شانہٗ کی سنت یہ ہے کہ وہ بندے سے کچھ لیتا ہے تاکہ اس کو آخرت میں اجرِعظیم عطا کرے، اور بندے کو چند چیزوں میں آزماتا ہے تاکہ اس کو بلندیِ درجات کا وسیلہ بہم پہنچائے۔ امام شافعی سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے بندہ آزمایش کی دعا کرے یا راحت کی، تو آپ نے فرمایا: آزمایش سے گزرے بغیر حقیقی راحت نصیب نہیں ہوسکتی۔

بندۂ مومن تین مراحل سے گزرتا ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس کے عمل میں کوتاہی اور کمی دَر آتی ہے اور وہ اپنے فرائض و واجبات سے غفلت برتتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو کچھ مصائب میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے رب کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری حالت میں مومن حق کی راہ پر استقامت سے گامزن رہتا ہے۔ پھر بھی اسے کچھ مصائب و آلام گھیر لیتے ہیں تاکہ اس کو آزمایا جائے۔ تیسری کیفیت یہ ہے کہ مومن کی زندگی بڑی راحت اور شان و شوکت سے بسر ہوتی ہے۔

گویا ہم تادیب، امتحان اور نوازش کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ یہ تینوں مراحل علیحدہ علیحدہ بھی پیش آسکتے ہیں اور ساتھ ساتھ بھی۔ ہر مومن کے پیش نظر یہ بات رہنی چاہیے کہ آزمایش ناگزیر ہے۔ کامیابی یہ ہے کہ آزمایش میں پورے اُتریں اور قضائے الٰہی پر راضی بہ رضا رہیں۔ یہ ایمان کے اعلیٰ مراتب میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو پسند کرتے ہیں تو اُسے آزماتے ہیں اور جب بندہ آزمایش میں صبر کا مظاہرہ کرتا ہے، تو اُسے مقربین میں شامل کر لیتے ہیں۔ قرآنِ مجید سے واضح ہوتا ہے کہ جس شخص کی آزمایش نہیں ہوتی، وہ منزل سے ناآشنا اُونٹ کی طرح بھٹکتا رہتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو انھیں کی گئی تھی بھلا دیا، تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انھیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہوگئے، تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے''۔ (الانعام ۶:۴۴)

ہم سب آزمایش اور امتحان سے گزر رہے ہیں۔ اس امتحان کی مدت انسان کی عمر ہے اور امتحان گاہ اس کا مستقر۔ دولت و ثروت، زیب و زینت، گھر، جایداد اور ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے، اس میں ہمارا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اس امتحان کے دو پرچے ہیں: ایک پرچہ وہ ہے جس کا مضمون ہمیں حاصل شدہ نعمتیں ہیں اور دوسرے پرچے کا مضمون وہ نعمتیں ہیں جن سے ہم دنیا میں محروم ہیں۔ اولادِ نرینہ کا نہ ہونا آزمایش ہے۔ لاولد ہونا آزمایش ہے۔ کثرتِ اولاد آزمایش ہے۔ اولاد کے فوت ہونے میں آزمایش ہے۔ دولت مند ہونا آزمایش ہے اور مفلسی اور فقر میں بھی آزمایش ہے۔ جاہ و جلال اور منصبِ عالیہ کا حاصل ہونا ایک آزمایش ہے اور گم نام ہونے میں بھی آزمایش ہے۔ ہر چیز جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور جو نہیں دی، ان سب میں بھی آزمایش ہے۔ نبی اکرمؐ نے کیا خوب دُعا سکھائی ہے: اَللّٰھُمَّ مَا رَزَقْتَنِی مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْہُ قُوَّۃً لِّی فِیْمَا تُحِبُّ ، اَللّٰھُمَّ وَمَا زَوَیْتَ عَنِّی مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْہُ فَرَاغًا لِی فِیْمَا تُحِبُّ ''خدایا! جو کچھ تو نے مجھے میری پسندیدہ چیزوں میں سے دیا ہے اسے اپنے پسندیدہ کاموں میں میرا مددگار بنادے۔ خدایا! جو کچھ تو نے میری پسندیدہ چیزوں میں سے روک رکھا ہے اُسے تو میرے حق میں ان چیزوں کے لیے موجب فراغ بنا جو تجھے پسند ہیں''۔ (ترمذی، کتاب الدعوات، حدیث ۳۸۲۹)

دنیا کی زینت میں آزمایش

یہ دنیا بہت حسین و مرغوب ہے۔ یہاں سبزہ زار ہیں۔ مرغوبات نفس، عورتیں، پُرآسایش کوٹھیاں ہیں اور مال واسباب ہیں۔ موٹر کاریں، دل چسپ سفر اور سیاحت کے مواقع ہیں، عمدہ کھانے، پُرتعیش محفلیں اور جاہ و منصب ہے۔ سورۂ کہف میں ہے: ''واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ اِن لوگوں کو آزمائیں، اِن میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔(الکھف ۱۸:۷)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو دولت دی اور ایمان والا بنایا۔ لیکن وہ فقرا، جو آپ کے اطراف میں رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے یہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یارب آپ نے ہمارے حصے کی دولت فلاں کو عطا کر دی اور اسے غنی کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زورِ قلم عطا کیا تاکہ حق کی تائید اور باطل کی تردید کرے۔ کیا آپ نے قلم کا حق ادا کر دیا؟۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو ایک اعلیٰ منصب عطا کیا۔ تو کیا آپ نے اس منصب کو مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا زور توڑنے کے لیے استعمال کیا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو طاقتِ گفتار عطا کی، تو کیا آپ اس طاقت کو حق کی ترویج اور باطل کی تردید کے لیے کام میں لائے؟

ہم دارالامتحان میں ہیں۔ ایک لمحہ بھی ہماری زندگی کا ایسا نہیں گزرتا جس گھڑی ہم آزمائے نہ جا رہے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مال و دولت، زرعی اور صنعتی پیداوار، زیب و زینت، اموالِ تجارت وغیرہ سے ہم آزمائے جا رہے ہیں۔ صحت و مرض کی بنیاد پر، طاقت اور کمزوری کے پیمانے سے، خوش حالی اور تنگ دستی کے حالات سے ہمیں آزمایا جا رہا ہے۔

جو صحت مند ہیں ان کی آزمایش صحت میں ہے۔ کیا انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنا وقت گزارا یا معصیت کا ارتکاب کرتے رہے؟ قوت و طاقت والوں کی آزمایش یوں ہوتی ہے کہ آیا انھوں نے اپنی قوت و طاقت حق کے لیے استعمال کی یا باطل کی خاطر۔ تنگ دستی اور کمزوری میں آزمایش یہ ہے کہ آیا ہم مایوس ہوگئے اور حالات سے سمجھوتہ کرلیا یا اللہ کی نصرت سے پُرامید رہے۔ خوش حال لوگوں کا امتحان یہ ہے کہ وہ اللہ کے شکرگزار رہتے ہیں یا نعمتوں کے ملنے کے بعد

خدا کو بھول جاتے ہیں۔ نبی کریمؐ کا فرمان ہے: ''اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے تمام تعریفیں ہیں کہ جس نے میری روح کو لوٹایا، مجھے صحت عطا کی اور اپنے ذکر کی توفیق بخشی''۔ گویا زینت حیات میں، نفس میں اور مال میں ہمارا امتحان ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''مسلمانو! تمھیں مال اور جان، دونوں کی آزمایشیں پیش آکر رہیں گی''۔(اٰل عمرٰن ۳:۱۸۶)

حق و باطل کا وجود

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے یہ طے کیا ہے کہ حق و باطل کی جنگ اس کرۂ ارض پر ہرزمانے میں جاری رہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے اور باقی سب ممکن الوجود۔ یہ ممکن تھا کہ صرف اہلِ ایمان کو اس زمین پر بسایا جاتا۔ حق و باطل کے درمیان کوئی جنگ نہ ہوتی، کوئی فتنہ نہ ہوتا، نہ بدرواُحد اور خندق کے معرکے ہوتے لیکن مشیت الٰہی یہ ہے کہ حق و باطل کے گروہ ہرزمانے میں رہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تاامروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (اقبالؒ)

شاید اس کی علّت یہ ہے کہ حق کی قوت باطل سے نبرد آزمائی ہی میں جلا پاتی ہے۔ اہلِ حق اسی کش مکش میں قربانی دے کر اور صبرآزمائی کا مظاہرہ کرکے جنت کے حق دار ہوسکتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ہم ضرور تمھیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے تمھاری آزمایش کریں گے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ: ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے''، انھیں خوش خبری دے دو۔ اُن پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں''۔(البقرہ ۲:۱۵۵-۱۵۷)

آزمایش کی اقسام

● **امانت میں آزمایش**: مال و دولت، جاہ و منصب، جایداد وغیرہ کے ذریعے ایک طرف ہمارا امتحان ہورہا ہے تو دوسری طرف ہمارا اپنا نفس، اولاد و رشتہ دار، صحت و مرض، حیات و موت، کامیابی و ناکامی، عزیز و اقارب کی موت ہمارا امتحان لے رہی ہے کہ ہم کیا رویہ اختیار کریں؟

کیا ہم صبر کے امتحان میں پورے اُترتے ہیں؟ گویا ہم دارالامتحان میں ہیں۔

امانتوں کی آزمایش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہمارا امتحان ہے کہ آیا ہم اس کے وفادار بندے بنے رہتے ہیں یا نہیں؟ ہم نماز کو پورے خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں یا نہیں؟ عبادات محض رسم کی طرح ادا کرتے رہے یا ان کو خوش دلی کے ساتھ ادا کرتے رہے؟ ان دونوں کیفیات میں بڑا فرق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ (الذاریات ۵۱:۵۶)

[اللہ] جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔ (المُلک ۶۷:۲)

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں: اچھے عمل سے مراد یہ ہے کہ کون اللہ کے محرمات سے اپنے آپ کو روکے رکھتا ہے؟ کون اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مسابقت کرتا ہے؟ کون کسی عزیز کی موت پر صبر کرتا ہے اور حیات پر شکرگزار رہتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے موت اور حشر کو جزا کے لیے اور حیات کو آزمایش کے لیے بنایا ہے، اور مومن کے سامنے یہ تصور واضح ہوتا ہے۔

● **شخصی آزمایش**: کبھی کبھی انسان کے لیے راحت و آسایش اور مال و دولت کی فراوانی یا تنگ دستی میں خصوصی آزمایش ہوتی ہے۔ دوسری طرف عمومی آزمایشیں مہنگائی، قہر، جبرواستبداد، قدرتی آفات وغیرہ کی شکل میں ہوتی ہیں: ''اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمایش کریں گے''۔ (البقرہ ۲:۱۵۵)

شخصی آزمایش کسی کی دولت میں ہوتی ہے تو کسی کی تنگ دستی میں، کسی کی اولاد کے ذریعے تو کسی کو لاولد رہنے میں، کسی کے ہاں صرف اولادِ نرینہ ہے اور کسی کے ہاں صرف لڑکیاں۔ کوئی کثرتِ عیال کے ساتھ تنگ دست ہے، کوئی کثرتِ اولاد بھی رکھتا ہے اور دولت بھی۔ بعض ایسے رئیس ہیں جن کی کوئی اولاد نہیں۔ جو حالت تمھاری دنیا میں ہے وہ تمھارے خصوصی امتحان کا پرچہ اور مضمون ہے۔ دانا وہ ہے جو اپنے شخصی امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تقدیر کے شر اور

ناپسندیدہ نتیجے پر رضاے الٰہی کو پانے کی کوشش کرنا ایمان ویقین کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمایش کرے۔ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے''۔ (الانعام ۶:۱۶۵)

اجتماعی زندگی میں آزمایش

آپ کسی کام پر مامور ہیں۔ آپ کے اُوپر افسرانِ بالا ہیں۔ آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان سب لوگوں میں آپ قابلیت کے اعتبار سے بہتر ہیں۔ یہاں ادنیٰ منصب ملنے میں آپ کی آزمایش ہورہی ہے۔ بعض اوقات نرسنگ سٹاف بعض ڈاکٹروں سے بہتر کارکردگی دکھاتا ہے۔ کہیں ایک عام فوجی اعلیٰ افسر سے زیادہ قابل ہوتا ہے۔ کچھ سرِ راہ معمولی تجارت کرنے والے غریب کسی بڑی کمپنی کے اعلیٰ افسر سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔

انسان کو چاہیے کہ وہ ممکنہ اسباب اختیار کرے اور پھر اللہ پر توکل اس طرح کرے جیسے اسباب کی کوئی قدر ہی نہیں۔ کسی کام کے لیے مقدور بھر کوشش کرنا اور مطلوبہ نتیجہ برآمد نہ ہونے پر اللہ سے راضی رہنا تقدیر پر ایمان کا مظاہرہ ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ میں امتحان میں ناکام ہوا کیوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے آزمانا چاہتے ہیں، سراسر جھوٹ ہے۔ اگر وہ فی الواقع امتحان کی تیاری سے غفلت برتتا رہا تو نتیجہ ناکامی کی صورت ہی میں نکلنا تھا۔ شخصی کوتاہی اور بے عملی کو تقدیر کے لکھے سے جوڑنا دین کا مذاق اُڑانے کے مترادف ہے ؎

تجاہل تساہل تغافل کیا
پڑا کام مشکل توکل کیا (میرؔ)

آپ نے کوئی زہریلی دوا بے احتیاطی سے گھر میں رکھ دی، جو بچوں کے ہاتھ لگ گئی۔ اب اس دوا کو پی کر کوئی بچہ ہلاک ہوجاتا ہے اور لوگ یہ سمجھیں کہ یہ تقدیر کا لکھا ہوا ہے، یہ سراسر عقیدے کی غلط تعبیر ہے۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ دوا کو بچوں سے دُور رکھا جاتا۔ یہ ایک اہم کام تھا جس سے غفلت برتی گئی، جو ایک خسارے کا سبب بنی۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں جہاں انسان ضروری احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھتا اور اس کا خمیازہ بھگتتا ہے۔

ایک اور مثال دیکھیں۔ ایک مریض بڑے جان لیوا مرحلے میں ہے۔ کسی ڈاکٹر کے پاس لایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کسی سے گفتگو میں مصروف ہے۔ مریض کو انتظار کرایا جاتا ہے اور وہ اس دوران انتقال کر جاتا ہے۔ فوری طبی امداد سے اگر مریض کو افاقہ ہونے کا امکان ہوتا تو ڈاکٹر پر قتل کا مقدمہ دائر کیا جانا چاہیے، کیوں کہ اس نے فوری طبی امداد فراہم نہ کی۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام ممکنہ اقدامات اور احتیاطی تدابیر اختیار کر لینے کے بعد چاہے مطلوبہ نتیجہ برآمد ہو یا نہ ہو، ہر دو صورت میں راضی بہ رضا رہنا تقدیر ہے۔ اور اگر اس کے برخلاف معاملہ ہو تو اس نتیجے کو اپنی کوتاہی کی سزا سمجھنا چاہیے ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات (اقبال)

حضورؐ نے کتنی خوب صورتی سے اس پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔ حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملے کا فیصلہ کیا، تو جو شخص مقدمہ ہار گیا جب وہ پیٹھ پھیر کر لوٹا تو اُس نے کہا: مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ عجز اور بے وقوفی پر ملامت کرتا ہے بلکہ تمھارے لیے ہوش مندی اور ہوشیاری لازم ہے۔ پھر اگر کسی وجہ سے تم ہار جاؤ تو کہو کہ مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے (ابوداؤد)۔ فی الواقع ہم حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْل (ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) کہنے میں اسی وقت حق بجانب ہوں گے جب ہم نے سارے اسباب اور احتیاطی تدابیر کو اختیار کیا اور مشیتِ الٰہی کے آگے سرِتسلیم خم کیا۔

اگر آپ اصولِ تجارت، بازار کے اُتار چڑھاؤ اور مال کی کھپت کا اندازہ قائم کیے بغیر تجارت میں مال لگاتے ہیں اور خسارہ ہوجاتا ہے۔ اب یہ کہنا کہ تقدیر میں خسارہ ہی لکھا ہوا تھا تو یہ صحیح نہیں۔ یہ اشد ضروری ہے کہ سارے اسباب و تدابیر کو اختیار کیا جائے، اور پھر اللہ پر توکّل کریں۔ اس طرح کہ اسباب و تدابیر کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسی توکّل کی آج اُمت مسلمہ کو بڑی سخت ضرورت ہے۔ مسلمان کوتاہ عملی کا شکار ہیں، اسباب و تدابیر کو اچھی طرح اختیار نہیں کرتے بس اللہ کی مدد اور معجزات کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

شراکت داری میں آزمایش

قرآنِ مجید میں مذکورہ درج ذیل واقعے پر غور کریں کہ شراکت داری کے معاملے میں کس طرح آزمایشیں ہوتی ہیں اور کیا رویہ اپنانا چاہیے۔ قصہ یوں ہے: ''تمھیں کچھ خبر نہیں پہنچی ہے۔ اُن مقدمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر اُس کے بالاخانے میں گھس آئے تھے؟ جب وہ داؤدؑ کے پاس پہنچے تو وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ انھوں نے کہا: ''ڈریے نہیں، ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے، بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں راہِ راست بتائیے۔ یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ۹۹ دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دُنبی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دُنبی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا''۔ داؤدؑ نے جواب دیا: ''اِس شخص نے اپنی دُنبیوں کے ساتھ تیری دُنبی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا، اور واقعہ یہ ہے کہ مل جل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں۔ بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور عملِ صالح کرتے ہیں، اور ایسے لوگ کم ہی ہیں''۔ (صٓ ۳۸:۲۱-۲۴)

اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو مکتب، شفاخانہ، جامعہ اور دیگر اُمور میں ذمہ دار بنایا۔ اس میں آپ کا امتحان یہ ہے کہ کام میں عدل کرتے ہیں یا ظلم کرتے ہیں؟ اپنے اقربا و اعزہ کا خیال کرتے ہیں یا عدل و انصاف اور اصولوں کو ترجیح دیتے ہیں؟ ایک مدرسے کے استاد کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو جو دیگر طلبہ کے ساتھ پڑھ رہا ہے نااہل ہونے کے باوجود امتیازی حیثیت دیتا ہے یا قابل طلبہ کو امتیازی کامیابی دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمایش کرے۔ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا ہے''۔ (الانعام ۶:۱۶۵)

اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ انسان کو سخت کوشی میں مبتلا کرے تاکہ انسان کی حقیقت آشکار ہوجائے اور جو منافق ہے اس کا پردہ فاش ہوجائے۔ فرمایا: ''جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں

تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔ وہ ان کی رسّی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں'' (البقرہ ۲:۱۴-۱۵)۔ مزید فرمایا: ''بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے''۔ (القیامۃ ۷۵:۱۴-۱۵)

کہا جاتا ہے کہ چند لوگوں کو ہر وقت بے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔ تمام لوگوں کو کچھ وقت کے لیے بے وقوف بنایا جاسکتا ہے لیکن تمام لوگوں کو ہر وقت بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا۔ اس پر یہ اضافہ کرلینا چاہیے کہ انسان کا اپنے رب کو اور اپنے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی دھوکا دینا ناممکن ہے۔

مومن آخرت کا طلب گار ہوتا ہے!

اب ہمارے دشمنوں کے احوال پر غور کریں۔ یہ بڑے طاقت ور اور سخت جان ہیں۔ شان و شوکت سے رہتے ہیں۔ ہر طرح کے اسلحے ان کے پاس ہیں۔ سائنس اور دیگر عصری علوم میں ماہر ہیں، بہت سے قدرتی وسائل انھیں حاصل ہیں اور ان کے مقابلے میں مسلمان اس کیفیت سے گزر رہے ہیں ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر (اقبالؔ)

یہ سوال ذہنوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمنانِ اسلام کو زلزلوں سے کیوں نہیں ہلاک کردیتا؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے: ''اللہ چاہتا تو خود ہی اُن (کافروں) سے نمٹ لیتا مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے آزمائے''۔ (محمد ۴۷:۴)

اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں اجرآخرت سے نوازے۔ ہمارے لیے جہاد و عمل کی راہیں ہموار کی گئی ہیں، تاکہ ہم کوشش پیہم کی جزا دیکھ لیں حالانکہ یہ بات عین ممکن تھی کہ اللہ تعالیٰ سارے اعدائے اسلام کو ایک آن میں ہلاک کردے۔ فرمایا: ''اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے، جو ایک دوسرے پر خوش آیند باتیں، دھوکے اور

فریب کے طور پر القا کر رہے ہیں۔ اگر تمھارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔ پس تم اُنھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں‘‘۔(الانعام ۶:۱۱۲)

بعض اوقات ابتلاے عام سے سابقہ پیش آتا ہے۔ زلزلے آتے ہیں، طوفان بادو باراں اور دیگر قدرتی آفات آجاتی ہیں۔ ان حالات میں بھی مومن راضی بہ رضا رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ہلاکت خیز آزمایشیں آخرت میں اس کا خسارہ نہیں کرسکتیں۔

گناہوں پر اصرار نہیں، رجوع الی اللہ

تمام شرائع میں گناہوں پر اصرار کی مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ’’خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا ہے۔ لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزہ چکھائے ان کو اُن کے بعض اعمال کا شاید کہ وہ باز آئیں‘‘ (الروم ۳۰:۴۱)۔ معاشرے میں جب فساد بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ابتلاے عام مسلط کر دیتا ہے۔ اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ انھیں ان کے اعمال کا مزہ چکھائے اور نہ یہ کہ تمام بُرے کاموں پر مزہ چکھائے، بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ بعض بُرے کام، جو کیے اس کے بدلے انھیں ہلاکت اور آزمایش سے گھیر لے تاکہ وہ پلٹ آئیں۔

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اے مہاجرین! پانچ چیزوں سے اللہ کی پناہ چاہو۔ کسی قوم میں فحاشی علی الاعلان ہونے لگے تو طاعون اور دیگر ایسے امراض پھیل جاتے ہیں جو اس قوم میں پہلے نہیں دیکھے گئے۔ جس قوم میں ناپ تول میں کمی کی جانے لگے تو افلاس اور قہر سلطانی اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ جس قوم نے مال پر زکوٰۃ ادا نہ کی تو آسمان سے بارش روک لی جاتی ہے اور اگر چوپائے زمین پر نہ ہوتے تو بارش ان پر مکمل روک لی جاتی۔ جو قوم اللہ کے عہد سے پھر جاتی ہے ان پر دشمن کی یلغار ہوتی ہے۔ جس قوم کے قائدین اللہ کی کتاب کے مطابق عمل نہیں کرتے، آپس میں لڑائی ان کا مقدر ہو جاتی ہے‘‘ (ابن ماجہ)۔ لہٰذا ہمیں گناہوں پر اصرار نہیں بلکہ ندامت کا اظہار کرنا چاہیے، اور ان سے اجتناب کرتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ آزمایش ہماری نجات، احوال کی بہتری اور سربلندی کا ذریعہ بن جائے۔

عالمِ اسلام کا مستقبل اور تحریکِ اسلامی

ڈاکٹر محمد رفعت

عالمِ اسلام کے سیاق میں بیسویں صدی کے دو اہم واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک استعماری طاقتوں سے آزادی ہے۔ پچھلی صدی کے وسط میں مسلمان ممالک مغربی طاقتوں کی غلامی سے آزاد ہوئے۔ آزادی کی تحریک چلانے میں مسلمانوں کے تمام عناصر شریک تھے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر ملک میں مسلمان علما اور اُن کے اداروں نے ان تحریکات میں نمایاں رول ادا کیا۔ آزادی کے حصول کے لیے مسلمانوں نے جو جدوجہد کی، اس کا ایک بنیادی محرک یہ توقع تھی کہ آزادی کے بعد وہ اپنے ملک اور سماج کی تعمیرنو اسلام کے مطابق کرسکیں گے اور اللہ کی نازل کردہ شریعت اُن کے آزاد ملک کا قانون ہوگی۔

بیسویں صدی کا دوسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ عالمِ اسلام میں ایسی تحریکیں اُٹھیں جنھوں نے اسلام کے قیام کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ برعظیم پاک و ہند میں جماعت اسلامی اور مصر میں الاخوان المسلمون کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ان تحریکوں نے اپنے کام کو تنظیمی شکل دی، اپنے پیغام کو وسیع پیمانے پر پھیلایا اور اسلام کی ترجمانی و تفہیم کے لیے مدلل لٹریچر شائع کیا۔ بیسویں صدی کے اختتام تک ان تحریکوں کے اثرات ساری دنیا میں پھیل چکے تھے۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کو انھوں نے خاص طور پر متاثر کیا اور اُن کی ایک قابلِ ذکر تعداد کی زندگیوں کا رخ بدل دیا۔

عالمِ اسلام میں پیش آنے والے بیسویں صدی کے اِن دو اہم واقعات کے پس منظر میں اس عوامی تحریک کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے، جس کا ظہور پچھلے چند برسوں میں عالمِ عرب میں ہوا۔ اس عوامی تحریک کو دنیا کے مبصرین نے عام طور پر حیرت اور استعجاب کے ساتھ دیکھا۔ بہت سے حلقوں

میں اس نئے مظہر سے خوش آیند توقعات وابستہ کی گئیں، وہیں جابر حکمرانوں کے درمیان تشویش اور بے چینی محسوس کی گئی۔ اب دنیا کے اور خود عالمِ اسلام کے سامنے اہم سوال یہ ہے کہ کیا یہ عوامی تحریک اپنی فطری منزل تک پہنچے گی یا منفی طاقتیں اس تحریک کا زور توڑ دینے میں کامیاب ہو جائیں گی؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے دو اہم امور پر غور کرنا ہوگا۔ ایک قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس عوامی تحریک کی فطری منزل کیا ہے اور اس تحریک کی کامیابی عالمِ اسلام میں کیا اساسی تبدیلی لائے گی؟ دوسرا اہم سوال اُن عوامل سے متعلّق ہے جو حالات پر اثر انداز ہوں گے۔ صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے ان داخلی اور خارجی عوامل کی نشان دہی ضروری ہے، جو عوامی تحریک کو کامیاب یا ناکام بنا سکتے ہیں۔ یوں تو یہ عوامل بہت سے ہیں، لیکن قابلِ ذکر اثر ڈالنے والے عوامل غالباً مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) مسلمان عوام (ب) نئی نسل کا تعلیم یافتہ عنصر (ج) مسلمان حکمراں طبقہ (د) دینی جماعتیں اور علما (ہ) مغربی طاقتیں

ان پانچ عوامل کے علاوہ ایک اہم عامل، اسلامی تحریک ہے۔ اسلامی تحریک کو اللہ کی تائید کے سہارے، ایسی منصوبہ بند جدوجہد کرنی ہوگی کہ اس کا رول، حالات کا رُخ متعین کرنے میں فیصلہ کن ثابت ہو۔ وہ دوسرے مثبت عوامل کو صحت مند تبدیلی کے حق میں استعمال کر سکے اور منفی عوامل کے اثر کو زائل کر سکے۔

عوامی تحریک کی منزل

دنیا کے عوام کے سامنے یہ تخیل پوری قوت کے ساتھ آچکا ہے کہ اُن پر حکومت کرنے والے اُن کی رائے سے منتخب ہونے چاہییں۔ دنیا میں مقبول اس تخیل کا اثر، عرب ممالک کے عوام پر بھی پڑا ہے، چنانچہ جن ممالک میں بادشاہتیں قائم ہیں یا جہاں ڈکٹیٹروں کی حکومت ہے، وہاں کے عوام اُن سے آزادی چاہتے ہیں۔ یہ توقع فطری ہے کہ عالمِ عرب میں جاری عوامی تحریک کا نتیجہ، ایسی حکومتوں کا قیام ہوگا جو عوام کی آزاد رائے سے منتخب ہوں گی۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ عالمِ عرب کی عوامی تحریک کا ظہور محض معاصر دنیا کے جمہوری رجحان کا عکاس نہیں ہے، بلکہ اُس کی جڑیں پچھلی صدی کی اس تحریک آزادی سے ملتی ہیں، جو استعمار کی غلامی سے نجات کے لیے عالمِ اسلام میں برپا ہوئی تھی اور جس کو عوام اور علما دونوں کا سرگرم تعاون حاصل تھا۔

دونوں تحریکوں کا یہ تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس حقیقت کا اِدراک عوامی تحریک کی فطری منزل متعین کردیتا ہے۔ یہ منزل ہر مسلمان ملک میں ایک ایسی حکومت کا قیام ہے جو اسلام کے مطابق ملک اور سماج کی تعمیرنو کا عزم رکھتی ہو اور جس کے چلانے والے، عوام کی آزاد مرضی سے منتخب ہوتے ہوں۔

دنیا کے ذرائع ابلاغ پر جن عناصر کا قبضہ ہے، انھوں نے یہ تخیل پیش کیا ہے کہ عوامی تحریک کے نتیجے میں ایک سیکولر جمہوری حکومت قائم ہونی چاہیے لیکن یہ خیال سطحیت پر مبنی ہے۔ یہ اُس تحریک آزادی کو نظرانداز کرتا ہے جس میں غیرمعمولی قربانیاں دی گئی تھیں اور جس کا سب سے قوی محرک، اسلامی نظامِ زندگی کے احیاء کا وہ جذبہ تھا، جس نے عالمِ اسلام کے عوام کو سرشار کررکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاصر عوامی تحریک پچھلی صدی کی تحریک آزادی کا تسلسل ہے چنانچہ اُس کی فطری منزل استعمار کی غلامی سے مکمل نجات اور شریعتِ الٰہی کو نافذ کرنے والی حکومت کا قیام ہے۔

کسی عوامی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے دنیا میں عموماً دو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک طرف ظلم، جبر اور تشدد کے ذریعے تحریک کو روکا جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ مظالم اور شدائد سے گھبرا کر تحریک کے علَم بردار اپنے مشن سے باز آجائیں گے۔ اگر تحریک چلانے والے ثابت قدمی کا ثبوت دیں اور قربانیوں کے لیے آمادہ ہوں تو عموماً یہ حربہ تحریک کا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہوتا، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زیادتیوں اور مظالم سے تحریک کو ایک نئی زندگی ملتی ہے ع

بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

البتہ تحریکوں کا راستہ روکنے کے لیے دنیا میں ایک دوسرا حربہ بھی استعمال ہوتا رہا ہے اور وہ زیادہ کارگر ہے۔ تحریک کے مخالفین یہ کوشش کرتے ہیں کہ تحریک کی منزل کے بارے میں خود اُس کے علَم برداروں کے ذہن میں انتشار اور خلجان (confusion) پیدا کردیا جائے۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہوجائے تو فکری انتشار، بہت جلد عملی انتشار کی شکل اختیار کرلیتا ہے یا تحریک انحراف (deviation) کی طرف لے جانے لگتی ہے۔ چنانچہ اس وقت دنیا کے ذرائع ابلاغ اسی سعی میں لگے ہوئے ہیں کہ عالمِ عرب کی عوامی تحریک کو اُس کی اصل منزل سے منحرف کردیا جائے۔ عالمِ اسلام کے باشعور عناصر کو پوری کوشش کرنی ہوگی کہ مفسدینِ عالم کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو، عوامی تحریک

انحراف کا شکار نہ ہونے پائے، بلکہ اپنی حقیقی منزل کی طرف گامزن رہے۔

عالمِ اسلام کا باشعور عنصر

مسلمانوں کی نفسیات کی تشکیل میں اسلام بنیادی رول ادا کرتا ہے لیکن دنیا کے مقبول نعرے اور نظریات، دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح، مسلمانوں کو بھی متاثر کرتے ہیں چنانچہ عالمِ عرب کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے تحت الشعور پر یقیناً اسلام کی حکمرانی ہے، لیکن اُن کے شعور پر اجنبی تصورات نے بھی اپنے اثرات ڈالے ہیں۔ سیکولرزم، نیشنلزم، علاقائی وقبائلی عصبیت اور عرب قومیت کے منفی اثرات اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے عرب دنیا کے مسلمانوں کے اسلامی شعور کو متاثر کیا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے اس عنصر کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے جو اِن باطل نظریات اور نعروں کے شر سے واقف ہے اور جسے اسلام کا صحیح فہم بھی حاصل ہے۔ اس عنصر کو تحریکِ اسلامی کہا جاتا ہے۔ عالمِ اسلام کو درست رہنمائی فراہم کرنا، اس عنصر کا بنیادی کام ہے۔

کسی انسانی گروہ کی رہنمائی کرنے کے لیے کچھ صلاحیتیں درکار ہیں۔ حالات کا درست تجزیہ کر کے پیش قدمی کی راہ نکالنے کی صلاحیت اُن میں سے ایک ہے۔ درست تجزیے کے لیے محض حالاتِ زمانہ کے متعلق معلومات کافی نہیں، بلکہ اُس نقطۂ نظر کا گہرا شعور بھی تجزیہ کرنے والوں کو حاصل ہونا چاہیے جس کے وہ علَم بردار ہیں۔ اسی طرح رہنمائی کے لیے درکار دوسری بنیادی صفت عزم وحوصلہ اور کردار کی پختگی ہے۔ اس وصف کے بغیر کوئی رہنمائی، انسانوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتی۔ ایک تیسری صفت جس کی ضرورت ہے، وہ وسیع النظری اور عالی ظرفی ہے۔ جس گروہ کی رہنمائی پیش نظر ہے اس کے تمام افراد، شعور کی پختگی کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ اُن کی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود صبر، حکمت، ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ اُن کی رہنمائی کا کام بڑا ظرف چاہتا ہے۔

اُمتِ مسلمہ بھی ایک انسانی گروہ ہے۔ اس کی رہنمائی کا فریضہ تحریک اسلامی کے سپرد ہے۔ چنانچہ تحریکِ اسلامی کو اپنے اندر بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کی صفات پیدا کرنی ہوں گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر کا مستند فہم، علَم بردارانِ تحریک کو حاصل ہو اور وہ حالات کا تجزیہ اس فہم کی روشنی میں کرسکیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج اُمتِ مسلمہ مختلف عصبیتوں کا

شکار ہے، جو قومی و وطنی بھی ہیں، قبائلی اور نسلی بھی اور مسلکی، فرقی و جماعتی بھی۔ ان حالات میں تحریکِ اسلامی کا ایک اہم کام یہ ہے کہ عصبیتوں سے مسلمانوں کو نجات دلائے، جائز اختلافات کو عصبیت بننے سے روکے اور دین کی بنیاد پر مسلمانوں کو یک جہتی، اتحاد، اجتماعیت اور اشتراکِ عمل پر آمادہ کرے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے یہ بہرحال ناگزیر ہے کہ تحریکِ اسلامی خود اپنے بارے میں چوکنّی رہے اور اپنے دامن کو کسی عصبیت سے آلودہ نہ ہونے دے۔ اس کا مقام تقاضا کرتا ہے کہ قرآن وسنت فی الواقع اس کی اساسِ کار ہوں، اُن کے دائرے کے اندر وہ تمام اہلِ ایمان کا یہ حق تسلیم کرے کہ وہ اخلاص کے ساتھ، علم کی روشنی میں قرآن وسنت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں۔ تحریکِ اسلامی کو ایسے رویے سے اجتناب کرنا چاہیے، جو اُسے ایک مسلک یا محدود مکتبِ فکر بنادے۔ اس کے دامن میں وہی وسعت ہونی چاہیے جو خود اسلام کے آفاقی تصور میں پائی جاتی ہے۔

عالمِ اسلام میں حالات بظاہر ایسے موڑ پر آچکے ہیں کہ مثبت اور منفی دونوں امکانات بروے کار آسکتے ہیں۔ مثبت امکان یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی شروع ہوجائے اور اس راہ کے مراحل طے ہونے لگیں۔ اس کے برعکس منفی امکان بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ عوامی تحریک کا رخ سیکولر نظام کی طرف موڑ دیا جائے۔ ان حالات میں اسلامی تحریک کا کردار کلیدی ہے۔ اُسے ذہنی، فکری اور عملی تیاری کے ساتھ امت کے تمام عناصر کی رہنمائی کرنی ہوگی۔ اگر اخلاص کے ساتھ علَم بردارانِ تحریک نے یہ کام انجام دیا اور تنگ نظری و عصبیت سے اپنے کو بچائے رہے تو توقع کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں کو اُن کی طرف راغب کردے گا، اُمت اُن کی رہنمائی سے مستفید ہوگی۔ استعمار کی چالیں ناکام ہوں گی اور عالمِ اسلام کی حقیقی آزادی کی راہیں کھلیں گی۔ تب اس کا بھی امکان ہے کہ عالمِ اسلام کی خوش گوار تبدیلیاں دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے لگیں اور نیشنلزم و سیکولرزم کے فتنوں سے نجات کی راہ، دنیاے انسانیت کو نظر آجائے۔ تحریکِ اسلامی کو موجودہ حالات، احتسابِ زمانہ کے ساتھ، خود احتسابی اور تجدیدِ عہد کی طرف متوجہ کرتے ہیں ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں، اپنے عمل کا حساب

مسلمان عوام

پوری دنیا میں مسلمان عوام، دین سے محبت کرتے ہیں اور دینی شعائر کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ تین کمزوریوں کا شکار ہیں۔ ایک کمزوری یہ ہے کہ اُن کے اندر دین کا علم بہت کم اور محدود ہے۔ عموماً دین کے بارے میں اُن کی معلومات کا ذریعہ وہ باتیں ہیں، جو انھوں نے مختلف مجالس میں سُن رکھی ہیں، جو غلط اور صحیح کا ملغوبہ ہیں۔ دین کے سرچشموں قرآن وسنت سے عوام کا رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے اور بعض نادان مخلصین اور ہوشیار مفسدین برابر یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ عوام قرآن وسنت سے واقف نہ ہونے پائیں۔

مسلمان عوام کی دوسری کمزوری اخلاقی پستی ہے۔ مغربی استعمار کی غلامی کی دو صدیوں نے اُن کے اخلاق وکردار کو بگاڑ دیا ہے۔ رسمی آزادی حاصل ہوجانے کے بعد مسلمانوں کی حکومتوں نے عموماً عوام کی دینی و اخلاقی تربیت کا کوئی اہتمام نہیں کیا ہے۔ اس کے برعکس بگاڑ کے لیے ذرائع ابلاغ جو کوشش کرتے ہیں، حکومتیں اُن کی سرپرستی کرتی ہیں۔ عوام کی ایک قابلِ ذکر تعداد اپنی معیشت کے سلسلے میں حلال وحرام کی قیود سے ناواقف ہے یا اُن سے بے پروا ہے۔ اصلاح وتلقین کرنے والے بھی عموماً اپنی گفتگو میں معیشت کو موضوعِ بحث نہیں بناتے۔ بددیانتی اور غیر ذمہ داری کے ساتھ مفاد پرستی بھی عام ہے۔ اپنے مفاد کے لیے لوگ، مفسدین کا آلۂ کار بننے کے لیے یا اُن کی لیڈری وسیادت قبول کرنے کے لیے بآسانی آمادہ ہوجاتے ہیں۔ دین سے لگاؤ کے باوجود فرض عبادات تک سے عوام کا ایک بڑا حصہ غافل ہے۔

عوام کی ایک تیسری کمزوری غلط مذہبیت ہے۔ تعویذ، گنڈے اور غیر مسنون اذکار اس کی علامت ہیں۔ جب یہ بگاڑ آگے بڑھتا ہے تو مشرکانہ رسومات، اور عرسوں کے اہتمام کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پیر اور مرشد کے ساتھ عقیدت میں غلو کیا جاتا ہے اور اس کی غیر مشروط اطاعت درست سمجھی جاتی ہے۔ بدعات کو بلاتکلف قبول کرلیا جاتا ہے اور قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اصل دین پر خودساختہ مذہبی رسوم ورواج کا بھاری بوجھ ڈال دیا جاتا ہے جو دین کی پُرکشش شبیہ کو چھپا دیتا ہے اور سلیم الفطرت طبیعتیں دین کی طرف راغب ہونے کے بجاے اس سے متنفر ہونے لگتی ہیں۔

یہ سمجھنا خام خیالی ہے کہ عوام کی دین سے محبت اور دینی شعائر سے اُن کی عقیدت، اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کے لیے کافی ہے اور عوام کی مندرجہ بالا کمزوریوں کو دُور کرنے کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقتِ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ عوام میں پائے جانے والی ان خرابیوں کی اصلاح کے بغیر اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی بہت مشکل ہے۔ جس طرح دستور اور قانون کے اندر اصلاح درکار ہے، اسی طرح عوام کی اصلاح کے لیے بھی منصوبہ بند کوشش ضروری ہے۔ بگڑا ہوا مسلم معاشرہ، اسلامی نظام کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اسلامی تحریک کو معاشرے کی ہمہ جہتی اصلاح کے لیے کام کرنا ہوگا۔ بلاشبہہ ایک صالح حکومت معاشرے کے سدھار کا کام بڑے پیمانے پر کرسکتی ہے، لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ حکومت ہی اس سلسلے میں واحد مؤثر عامل ہے۔ معاشرے کو متاثر کرنے والے بہت سے عوامل ایسے بھی ہوتے ہیں، جو حکومت کے کنٹرول میں نہیں ہوتے۔ اس لیے معاشرے کی اصلاح اور حکومتی ڈھانچے میں تبدیلی دونوں کی ضرورت ہے۔

نئی نسل

مسلمانوں کی نئی نسل دین سے محبت میں اپنے بزرگوں سے پیچھے نہیں، البتہ دو باتیں اُسے دین اور دین دار لوگوں سے دُور کرتی ہیں:

(الف) مسلمانوں کے مسلکی جھگڑے اور (ب) دین دار لوگوں کے کردار کی پستی۔

تحریک اسلامی کا کام یہ ہے کہ اس نئی نسل کے سامنے دین کی وہ تصویر پیش کرے، جو اِن کمزوریوں سے پاک ہو۔ نئی نسل کو اللہ کے دین کے حقیقی پیغام سے واقف ہونا چاہیے، جو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ پھر اُن کے سامنے یہ بات بھی آنی چاہیے کہ اختلاف کی جائز حدود کیا ہیں اور ایسے اختلافات کے باوجود اتحادِ عمل کی راہ کیا ہے۔ اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ تحریکِ اسلامی، نوجوان نسل کو اُن دین دار افراد سے متعارف کرائے جن کا اخلاق بلند اور کردار بے داغ ہے۔ اللہ کے فضل سے ماضی میں بھی امت میں بلند کردار افراد موجود تھے اور آج بھی وہ امت کی زندگی کی علامت ہیں۔

مسلمانوں کی نئی نسل خواندگی اور تعلیم کے اعتبار سے اپنے بزرگوں سے آگے ہے۔ تعلیم نے اُسے مغربی کلچر سے روشناس کرایا ہے۔ جمہوریت کے نعرے اس نے سُنے ہیں اور اُس کے مظاہر

دیکھے ہیں۔ ٹکنالوجی اور سائنس کی ترقی کا اثر اُس نے قبول کیا ہے۔ تحریکِ اسلامی کو چاہیے کہ اس پس منظر میں نئی نسل کی رہنمائی کرے۔ مغربی کلچر کا ایک وصف، بحث و گفتگو کی آزادی ہے۔ اخلاقی حدود کی پابندی کے ساتھ اسلام اس کا قائل ہے۔ اسی طرح ذرائع ابلاغ اور ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کو اسلام درست سمجھتا ہے بشرطیکہ یہ استفادہ حدود اللہ اور اسلام کے ضوابط کے تحت ہو جو اللہ نے مقرر کیے ہیں۔ اسلام اُس طرزِ حکومت کا قائل ہے، جس میں حکمراں، عوام کی مرضی سے چُنے جائیں اور اس سلسلے میں معاصر رجحان کی تائید اسے حاصل ہے۔ تحریکِ اسلامی مسلمانوں کی نئی نسل کو ان تمام امور کے سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر سے آگاہ کرسکتی ہے اور یہ کام اسے ضرور کرنا چاہیے۔

عالمِ اسلام میں برپا عوامی تحریک میں نئی نسل نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ابھی تک اُن کی دل چسپی زیادہ تر جمہوریت کی بحالی سے ہے۔ اُن کے سامنے وہ سارے پہلو بھی آنے چاہییں جن میں مغربی جمہوریت اصلاح کی محتاج ہے۔ تحریکِ اسلامی یہ تجزیہ پیش کرے تو نئی نسل کو اسلامی نقطۂ نظر پر مطمئن کرنا کوئی مشکل امر نہ ہوگا۔ اسی طرح یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جمہوریت سیاسی نظام کے محض ایک پہلو کا نام ہے۔ سیاسی نظام کے سلسلے میں اساسی سوال یہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے سلسلے میں ہدایت کہاں سے اخذ کی جائے گی؟ اسلام کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس ہدایت کا ماخذ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی ہے، جو اس کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت میں موجود ہے۔ تحریکِ اسلامی کو چاہیے کہ اس نقطۂ نظر سے نئی نسل کو واقف بھی کرائے اور انھیں مطمئن بھی کرے۔

سیکولرزم کے حق میں ذرائع ابلاغ کا پروپیگنڈا جاری ہے۔ تحریکِ اسلامی کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ سیکولرزم کے تجربے کا تنقیدی جائزہ لے کر بتائے کہ وہ انسانی مسائل حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ سیکولر تہذیب تین صدیوں سے دنیا کے ایک بڑے حصّے پر حکمراں ہے۔ اس نے دنیا میں امن کے قیام کے بجائے دنیا کو استعماری طاقتوں کا غلام بنادیا ہے۔ سیکولر ٹکنالوجی نے خشکی اور تری میں فساد برپا کرکے دنیا کو ماحولیاتی بحران سے دوچار کیا ہے۔ سیکولر نظریے کے تحت اباحیت اور بے حیائی کو فروغ ملا ہے۔ انسانی قدریں پامال ہورہی ہیں اور خاندان بکھر رہے ہیں۔

مسلمان حکمراں طبقہ

مسلمانوں کے حکمراں طبقے میں مخلص اور باکردار افراد بھی موجود ہیں، لیکن بہت کم۔ اس

طبقے کی اکثریت تین بڑی کمزوریوں کا شکار ہے:

(الف) دین سے ناواقفیت اور اس سے بے پروائی

(ب) کردار کی پستی اور مسرفانہ طرزِ زندگی

(ج) مفاد پرستی اور مغرب سے مرعوبیت۔ ان کمزوریوں نے اُن کو بزدلی اور خوف میں بھی مبتلا کردیا ہے اور وہ بآسانی اپنے ملک اور امتِ مسلمہ کے خلاف غداری پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

اِن حالات میں تحریکِ اسلامی کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے پر توجہ کرے۔ حکمران عموماً اسی طبقے سے تعلّق رکھتے ہیں۔ تعلیم یافتہ افراد میں مندرجہ بالا کمزوریاں پائی جائیں تو اُن کی اصلاح کی ہمہ جہتی کوشش کی جانی چاہیے۔ یہ مسلم معاشرے کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ دوسری طرف مسلمان عوام کو اس جانب متوجہ کیا جانا چاہیے کہ اگر حکمرانوں کا انتخاب اُن کے اختیار میں ہو تو وہ ایسے افراد کو منتخب کریں جو ان نمایاں کمزوریوں سے پاک ہوں۔

یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ عالمِ اسلام حقیقی سیاسی آزادی اُس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا اور اسے برقرار نہیں رکھ سکتا، جب تک وہ صنعت وحرفت اور سائنس وٹکنالوجی کے میدانوں میں قابلِ لحاظ ترقی نہ کرلے۔ یہ ترقی اس حد تک ہونی چاہیے کہ عالمِ اسلام معاشی، تکنیکی اور حربی پہلو سے خودکفیل (self reliant) ہوجائے۔ اس کیفیت کے بغیر حکمرانوں کی نیک کرداری بھی ملک کو غلامی سے نہیں بچاسکتی۔ خودکفیل ہونے کے لیے منصوبہ بند کوشش درکار ہے۔ عالمِ اسلام کے تمام عناصر کو اس سلسلے میں کام کرنا ہوگا اور تحریکِ اسلامی ان کوششوں میں تعاون پیش کرسکتی ہے۔ خواندگی کا اہتمام، تعلیم کی ترقی، سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے اداروں کا قیام، صنعت وحرفت نیز زراعت کی ترقی کا اہتمام اور ان کاموں کے لیے ضروری وسائل کی فراہمی ضروری ہے۔ ان تمام امور میں مسلمان ممالک کا آپسی تعاون بھی درکار ہے۔ ملک کی آزادی کے لیے بنیادی شرط تو آزادی کی طلب اور اس کے حصول کا جذبہ ہے، لیکن اس کو برقرار رکھنے کے لیے خودکفیل ہونا بھی شرط ہے۔

دینی جماعتیں اور علما

بہت سے روایتی دینی حلقے جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون سے مختلف امور میں اختلاف

کرتے رہے ہیں اور یہ جماعتیں اُن کی تنقید کا ہدف بھی بنی ہیں۔ اس واقعے کے باوجود ایسے افراد، ان حلقوں میں ہمیشہ پائے جاتے رہے ہیں، جنھوں نے جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس تنقید کے باوجود جو بعض دینی حلقوں کی طرف سے کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تحریک کی نمایندہ تنظیمیں اور روایتی دینی حلقے، اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ چنانچہ اسلامی نظام کے قیام کی جانب پیش رفت میں تحریکِ اسلامی کو اُن تمام عناصر کا تعاون حاصل ہونا چاہیے جو دین کے لیے مخلص ہیں اور دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اس تعاون کے راستے میں آخر کیا چیز رکاوٹ ہے؟

اِس سوال پر غور کیا جائے تو دو ممکنہ رکاوٹوں کی نشان دی کی جاسکتی ہے: (الف) تنگ نظری اور جماعتی و مسلکی عصبیت اور (ب) مفاد پرستی۔ چنانچہ اسلامی تحریک کو کوشش کرنی چاہیے کہ خود اس کا دامن اِن کمزوریوں سے پاک ہو۔ پھر اُسے اِس طرف توجہ کرنی چاہیے کہ دینی حلقوں اور جماعتوں میں وسیع النظری اور باہمی تعاون کی فضا فروغ پائے۔ اس سلسلے میں نوجوانوں سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ عموماً اُن کے مزاج میں گروہی عصبیت کے بجائے حق پسندی غالب ہوتی ہے اور مفاد پرستی کے بجائے اُن میں راہِ حق میں قربانی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

حالات پر اثر انداز ہونے والا آخری اہم عامل مغربی طاقتیں ہیں۔ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، اپنے استعماری عزائم کے ساتھ پوری دنیا پر مسلط ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، اسلام کی دعوت اُن تک پہنچنی چاہیے، اسی طرح ہر فرد چاہے وہ حکمراں طبقے سے تعلق رکھتا ہو، اس کا مستحق ہے کہ اُس کو فلاح ونجات کی راہ دکھائی جائے، لیکن جہاں تک جبر و استبداد پر مبنی، عالمی سرمایہ داری کے نمایندے، استعماری نظام کا تعلق ہے، اس کے خلاف مسلسل، منصوبہ بند اور اَن تھک جدوجہد کی ضرورت ہے۔ تحریکِ اسلامی کا کام یہ ہے کہ اس عظیم جدوجہد کے سلسلے میں انسانوں کی رہنمائی کرے۔ اس راستے میں اُسے دنیا کے اُن تمام عناصر کا تعاون حاصل ہوگا، جو اللہ کی زمین پر عدل وانصاف کا قیام چاہتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ کی ایک نادر تصنیف: تاریخ دکن

معین الدین عقیل

حیدرآباد دکن یا مملکتِ آصفیہ حیدرآباد ہندستان کے اُن علاقوں میں سے ایک ہے، جو اپنی تاریخی اہمیّت اور اپنی تہذیبی شان و شوکت کے لحاظ سے ایک انفرادی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین نے بھی اس علاقے اور اس کی تاریخ اور اس کی تہذیبی انفرادیت پر کماحقہٗ توجہ دی ہے۔ اس موضوع پر کثیر تعداد میں کتب تواریخ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ، کتب خانوں اور علمی ذخیروں میں موجود ہیں۔ اسی ضمن میں دکن یا مملکتِ حیدرآباد کی تاریخ پر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) کی دو تصانیف: دولتِ آصفیہ اور مملکت برطانیہ، سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر[1] اوردکن کی سیاسی تاریخ[2] بھی اہم اور معروف ہیں۔

مولانا مودودیؒ ایک مفکر و عالم کی حیثیت وشہرت کے حامل ہیں لیکن تصنیف و تالیف کے ابتدائی دور میں انھوں نے تاریخ کے مطالعے اور تراجم میں زیادہ دل چسپی لی تھی اور اپنی نوجوانی ہی میں متعدد اہم مقالات و کتابیں تصنیف کیں جو شائع بھی ہوئیں۔ مذکورہ تصانیف اسی ضمن میں ان کی ابتدائی کاوشیں ہیں۔ ان میں سے اول الذکر ایک عصری تناظر میں لکھی گئی تھی اور ایک تاریخی تسلسل اور عمومی دل چسپی کا اس میں احاطہ نہیں کیا گیا تھا لیکن مملکتِ آصفیہ کی ایک ایسی تاریخ جس میں اس کے قیام کا پس منظر اور عہد بہ عہد حالات و واقعات شامل ہوں، مولانا مودودیؒ کی نظر میں اس کی ضرورت موجود تھی۔ چنانچہ اپنی مذکورہ اول الذکر کتاب کی تصنیف اور اشاعت کے بعد انھوں نے اس ضرورت کے ذیل میں اپنی اس تصنیف کے لیے جب وہ ۱۹۳۰ء میں بھوپال میں چند ماہ مقیم رہے، تو مواد جمع کرنا شروع کیا تھا اور وہاں سے جولائی ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد منتقل ہوئے تو

وہاں اسی جستجو اور مآخذ کی جمع آوری میں منہمک ہو گئے۔[۳]

ان کا ارادہ ایک مفصل تاریخ لکھنے کا تھا جو چار جلدوں پر مشتمل ہوتی۔ انھوں نے اس کا آغاز بھی کر دیا تھا لیکن اسے دیکھ کر ان کے ایک مقامی دوست مولوی احمد عارف نے مشورہ دیا کہ ان کا منصوبہ تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی کتاب کی ضرورت بھی موجود ہے جو مبتدی طلبہ کے لیے ہو۔ یہ مشورہ انھیں پسند آیا۔ چنانچہ انھوں نے اس پر عمل شروع کر دیا اور بہت آسان اسلوب میں دکن کے عہد قدیم سے قطب شاہی تک کے مختصر حالات لکھ دیے۔ پھر یہ طے ہوا کہ خود مولوی احمد عارف بھی اس تصنیف میں شریک ہو جائیں گے۔ چنانچہ مولوی احمد عارف نے اس میں شامل کرنے کے لیے مغلیہ عہد اور آصف جاہی عہد کے حالات تحریر کیے۔ اس طرح ایک مشترکہ کوشش سے ایک مختصر کتاب تاریخ دکن مرتب ہو گئی اور شائع بھی ہو گئی۔[۴]

یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر خود مولانا مودودی نے اپنی 'خودنوشت' میں مختصر تاریخ دکن کے طور پر کیا ہے لیکن اس کا ذکر ان کی تصانیف کی کسی فہرست میں نظر نہیں آتا[۵]، اور نہ اس کا پھر کہیں کسی جگہ ذکر ہوا، جب کہ دکن کے تعلق سے مولانا مودودیؒ کی کُل کاوشوں پر اور دکن و حیدرآباد سے ان کی نسبتوں پر خاص طور پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین فاروقی نے حیدرآباد دکن میں رہ کر دادِ تحقیق بھی دی۔[۶]

مولانا مودودیؒ کے یہ دوست مولوی احمد عارف (م: ۱۹۴۹ء) حیدرآباد دکن کے معزز اور معروف شخص تھے۔ وہاں کے اکابر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ادب اور فنون لطیفہ سے خاصی دل چسپی تھی۔[۷] وہ صحافت سے منسلک تھے اور ایک بہت مؤثر اخبار صبحِ وطن کے مدیر تھے۔ اس اخبار کو قومی تحریکوں میں قومی اُمنگوں کی ترجمانی اور حکومتِ وقت کی تائید و حمایت کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل تھی۔[۸]

ہمیں حال ہی میں اس نادر و نایاب کتاب کا ایک نسخہ ملا ہے۔ ذیل میں ہم اس کا دیباچہ (از قلم مولانا مودودی) نقل کر رہے ہیں، جس سے اندازہ ہو گا کہ یہ کتاب طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی اور اس کا مقصد انھیں دکن کی تاریخ سے واقف کرانا تھا۔ ساتھ ہی مولانا ان میں تاریخ کے مطالعے

بلکہ تاریخ کے فلسفیانہ مطالعے کا ذوق وشوق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کتاب کو موضوعات اور عہد کے لحاظ سے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا، لیکن ہر باب کو بھی ذیلی اسباق میں تقسیم کیا گیا، تاکہ طلبہ ہر عہد کی ذیلی موضوعاتی تفریق و تقسیم کی مصلحت سے بھی واقف ہوسکیں اور تاریخ کو ان کے تناظر میں سمجھ سکیں۔

تاریخِ دکن کی نایابی اور ندرت، اور مولانا مودودی کی ایک غیر معروف تصنیف ہونے کے باعث، اس کا دیباچہ اور فہرستِ مضامین، مع صفحات نمبر، ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

ص ا: ''تین چار سال سے مَیں دکن کی ایک مفصل تاریخ لکھنے میں مشغول ہوں، جس کے متعلّق میرا اندازہ ہے کہ چار جلدوں میں تمام ہوگی۔ اس کے بعض حصوں کو دیکھ کر میرے دوست مولوی احمد عارف صاحب نے یہ رائے دی کہ یہ کتاب تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید ہوسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی کتاب کی بھی ضرورت ہے جس میں مبتدی طلبہ کے لیے تاریخ کا ایک مختصر اور واضح خاکہ کھینچا جائے۔ ان کی اس تجویز کے مطابق میں نے قدیم زمانے سے قطب شاہی عہد تک کے مختصر حالات لکھ دیے اور ان پر مغل اور آصف جاہی عہد کے حالات کا اضافہ مولوی احمد عارف صاحب نے کیا۔ اس متحدہ کوشش سے یہ کتاب مرتب ہوئی۔

''جہاں تک کتاب کے حُسن و قبح کا تعلّق ہے اس کو جانچنا ناقدین کا کام ہے۔ البتہ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے حتی الامکان اس کا تاریخی مواد نہایت معتبر و مُستند مآخذ سے اخذ کیا ہے اور ایسے واقعات درج کرنے سے پرہیز کیا ہے جن کی سند مشتبہ ہو۔

''اس کتاب میں جن باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں کہ مبتدی طلبہ کے ذہن میں دکن اور اس کی جغرافی، نسلی، لسانی، تاریخی اور عمرانی حالات کی ایک صاف اور واضح تصویر [نقش] ہوجائے۔ مختلف زمانوں میں جو قومیں یہاں ــــ ص۲: آئیں اور جو سلطنتیں قائم ہوئیں ان کے زمانی اور جغرافی حدود، ان کے پیدا کردہ تغیّرات اور ان کے چھوڑے ہوئے اثرات کو طلبہ کی استعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے، روشن خطوط کے ساتھ نمایاں کردیا گیا ہے۔ پرانی لکھی ہوئی کتابوں کی تقلید میں دکن کی تاریخ کے متعلّق جو نظریات قائم کرلیے گئے تھے، ان کو چھوڑ کر وہ نظریات اختیار کیے گئے ہیں جو جدید تحقیق و مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ کوشش کی گئی ہے کہ مبتدی طلبہ کے

ذہن میں ابھی سے ایک غیر محسوس طور پر تاریخ کے فلسفیانہ مطالعے کی بنا پڑ جائے۔

''بچوں کو یہ کتاب پڑھاتے وقت اساتذہ کو دو باتوں کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھنا چاہیے: ایک یہ کہ دو دفعہ پڑھائی جائے۔ پہلی دفعہ میں تاریخ کا صرف ایک عمومی خاکہ ذہن نشین کرنے کوشش کی جائے اور دوسری دفعہ میں تفصیلات یاد کرائی جائیں مگر تفصیلات میں بھی غیر اہم اشخاص اور سنین کی طرف زیادہ توجہ نہ کی جائے۔ دوسری یہ کہ ہر سبق کو پڑھانے سے پہلے استاد خود اس کو غور سے پڑھے اور یہ رائے قائم کرے کہ اس سبق میں کون سی باتیں اہم ہیں، نیز وہ نقشے کی مدد سے اس سبق کو اچھی طرح سمجھ بھی لے۔ پھر وہی سبق بچوں کو لیکچر کے انداز میں پڑھائے اور بار بار نقشے سے مدد لیتا جائے۔ اس کتاب میں جو نقشے دیے گئے ہیں، صرف ان ہی پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں ہے، ہر تاریخی تغیّر اور اہم واقعے کو سمجھانے کے لیے نقشے کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کتاب میں اتنے نقشے نہیں دیے جاسکتے''۔

مولانا مودودی نے اس کتاب کے چھے ابواب تحریر کیے، جن کے عنوانات یہ ہیں: ● ہمارا ملک اور اس کے باشندے ● دولتِ آصفیہ کا رقبہ اور آبادی ● پرانے زمانے کی تاریخ ● دکن کی آریہ اور دراوڑ ریاستیں ● دکن میں مسلمانوں کی آمد ● سلطنتِ بہمنیہ ● دکن کی پانچ ریاستیں۔ یہ ابواب کُل ۱۷۱ صفحات پر مشتمل ہیں، جب کہ کتاب کی کُل ضخامت ۲۲۴ صفحات ہے۔ اس طرح ۵۳ صفحات مولوی احمد عارف نے تحریر کیے تھے۔ گویا تین چوتھائی کتاب مولانا کی کاوش کا نتیجہ ہے اور ایک چوتھائی مولوی احمد عارف صاحب کی تحریر ہے۔

حوالے اور حواشی

۱- شائع کردہ: کتب خانہ رحیمیہ، دہلی، ۱۹۲۸ء۔ یہ تصنیف بعد میں ۱۹۴۱ء میں عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد نے دوبارہ شائع کی۔ اس کی دوسری اشاعت میں کچھ ترامیم بھی شامل کی گئی تھیں، جیسے 'معاہدۂ برار' کا متن اضافہ کیا گیا۔ اس کی مزید ایک اشاعت (سوم) کا اہتمام ہفت روزہ آئین، لاہور نے ۲۵ جون ۱۹۸۷ء کے شمارے میں، اپنی خصوصی اشاعت کے طور پر کیا۔

۲- مطبوعہ: دارالاشاعت سیاسیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء۔ بعد میں یہ کتاب اسلامک پبلی کیشنز لاہور سے اگست ۱۹۶۸ء میں اور پھر جون ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔

۳- سیّدابوالاعلیٰ مودودی، ''خودنوشت''،(مشمولہ: ادب اور ادیب، سیدمودودی کی نظر میں (مرتبہ:سفیراختر) دارالمعارف، واہ کینٹ، جنوری ۱۹۹۸ء، ص۲۹

۴- مطبع عہدآفریں، حیدرآباد، ۱۳۵۱ھ۔

۵- مشمولہ: ادب اور ادیب، سیدمودودی کی نظر میں ،ص ۱۹، ۴۳۔ اس تصنیف کا ذکر اور اشاعتی تفصیلات کسی اور جگہ دستیاب نہیں۔ یہاں تک کہ نصیرالدین ہاشمی صاحب نے ''دکن کی تاریخوں پر ایک نظر'' (مشمولہ: تاریخ و سیاست، کراچی ، نومبر۱۹۵۳ء، ص ۶۱-۹۸) کے عنوان سے اپنی مرتبہ وضاحتی فہرست میں بھی اس کا ذکرنہیں کیا، جو ان کی قریب العہد تصنیف ہے۔ اس تصنیف کے دو نسخے کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، کراچی میں شمار: الف ۳/۱۹، ۱۰ اور ۱۱ کے تحت موجود ہیں۔ راقم نے اس تصنیف پر ایک علیحدہ تعارفی مضمون تحریر کیا ہے۔ اس تصنیف کے دو نسخے کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، کراچی میں الف ۳/۱۹، ۱۰اور ۱۱ کے تحت موجود ہیں۔

۶- مقالہ، بعنوان: ''مولانا مودودی اور حیدرآباد دکن''، مشمولہ: تذکرۂ سیدمودودی (مرتبہ: جمیل احمد رانا، سلیم منصور خالد) جلد۳، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۱۲-۳۳۱۔

۷- سید محمد جعفری، اسٹار ڈائرکٹری ،اسٹار پریس، الٰہ آباد، سن ندارد، ص ۴۴۴-۴۴۵، صبح وطن، ۱۹۲۸ء میں جاری کیا تھا۔ سیدممتاز مہدی، حیدرآباد کے اُردو روزناموں کی ادبی خدمات۔ قومی کونسل برائے قومی زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۴۱، دارالعلوم، حیدرآباد سے فارغ التحصیل تھے۔ ۱۹۴۸ء میں یہ اخبار بند ہوگیا، طیب انصاری، حیدرآباد میں اُردو صحافت۔ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد، ۱۹۸۰ء، ص ۶۰۔

۸- اس اخبار میں اسی زمانے میں کہ جب یہ کتاب لکھی جارہی تھی، مولانا مودودی نے دکن کی تاریخ کے ایک اہم اور غیرمطبوعہ ماخذ فتوحاتِ آصفی ، مصنفہ ابوالفیض معنی کا بغائر مطالعہ کیا اور ایک مفصل مقالہ اس کی اہمیت اور خصوصیات و مندرجات پر لکھا جو اس اخبار کے 'سالگرہ نمبر'، ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوا۔ مولانا مودودی کا یہ اہم مقالہ بھی غیرمعروف اور غیرمدوّن ہے۔ اس مقالے کی اہمیت کے پیش نظر ایک ضروری تعارف وحواشی کے ساتھ راقم نے اسے بغرضِ اشاعت علیحدہ مرتب کیا ہے۔

۹- ص ۱۔

۱۰- ص ۱-۲۔

مقالہ نگار شعبہ اُردو ، جامعہ کراچی کر سابق صدر ہیں


راس الحکمۃ مخافۃ اللّٰہ
WISE
WOMEN'S INTERNATIONAL SCHOOL OF EXCELLENCE
فیڈرل بورڈ اسلام آباد سے الحاق شدہ
خواتین کی تعلیم وتربیت کا معیاری رہائشی ادارہ
وائز سکول اینڈ کالج
برائے خواتین
مکمل اسلامی ماحول کے ساتھ
معیاری ہاسٹل
5 کنال پر مشتمل کشادہ اور وسیع کیمپس
جدید ترین سائنس و کمپیوٹر لیب
جسمانی تربیت اور کھیلوں کے لیے Indoor گراؤنڈ
قرآن مجید "مکمل" ترجمہ و تفسیر کے ساتھ
مستحق مگر ذہین طالبات کے لیے خصوصی سکالرشپ
انگلش/عربی لینگویج، خطاطی، پینٹنگ اور سلائی کڑھائی کے خصوصی کورسز
WE OFFER
School Section
Play Group to Matric
Science / Arts
College Section
F.A/F.Sc/ICS/B.A/B.Sc
زیرنگرانی
حافظ تنویر احمد
ڈائریکٹر
APPLY NOW
FOR
F.A, F.Sc, ICS
&
B.A, B.Sc
WISE School & College
New Abadi, Bhara Kahu, Islamabad
Tel: 051-2303663, 2303940 E-mail: wiseisb@yahoo.com
Website: wise.org.pk

غزہ کی جنگ، مغرب کی اپنی پسند

ناتھن تھرال

اس وقت جب کہ حماس اسرائیلی شہریوں پر راکٹ فائر کر رہی ہے اور اسرائیل ہوائی حملوں کے بعد غزہ میں زمینی کارروائی کر رہا ہے، اس تازہ ترین جنگ کا فوری سبب نظرانداز کیا جارہا ہے۔ یعنی اسرائیل اور عالمی برادری نے، اوائل جون میں فلسطین کی قومی مفاہمتی حکومت کے راستے میں متعدد رکاوٹیں کھڑی کیں۔

اس مفاہمتی حکومت کی تشکیل بڑی حد تک حماس کی مایوسی اور تنہائی کی بنیاد پر تھی۔ شام اور ایران سے ان کا اتحاد بکھر چکا تھا۔ جولائی ۲۰۱۳ء میں ان کے حامی صدر مرسی کے بجاے ایک کٹر مخالف جنرل عبدالفتاح سیسی کے برسرِ اقتدار آنے سے اخوان المسلمون سے ان کا تعلّق ایک بوجھ بن گیا۔ جب جنرل سیسی نے غزہ آنے والے سامان کے لیے سرنگیں بند کیں اور ٹیکس کے محاصل جن پر حکومت کا انحصار تھا وہ بند ہوگئے، تو حماس کے خزانے خالی ہوگئے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ جو حکومت اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری نہیں کرسکتی اس کے خلاف عوامی احتجاج ہوگا، حماس نے تختہ اُلٹنے کے اندیشے سے بچنے کے لیے غزہ کا سرکاری کنٹرول چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۰۰۶ء کے آخری انتخابات جیتنے کے باوجود حماس نے رام اللہ میں فلسطینی قیادت کو اختیارات منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے حماس اور پی ایل او کے درمیان ایک صلح کا معاہدہ ہوا، جس کی تمام تر شرائط پی ایل او اور فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس نے طے کی تھیں۔

اس معاہدے سے جو دو سب سے زیادہ ضروری فوائد حماس کو اور غزہ کے شہریوں کو حاصل ہونا تھے وہ یہ تھے:

۱- حکومت حماس کے لیے کام کرنے والے ۴۳ ہزار سرکاری ملازمین کو تنخواہوں کی ادایگی کہ وہ نئے انتظام کے تحت غزہ کا انتظام چلائیں۔

۲- اسرائیل اور مصر نے غزہ کے رہنے والوں کے لیے سرنگوں کے جو راستے بند کیے تھے انھیں کھولا جائے۔

معاہدے کے فوراً بعد اسرائیل نے ایسے اقدامات کیے کہ حماس اور غزہ کے شہریوں کو یہ فوائد حاصل نہ ہوسکے۔

کئی لحاظ سے یہ حکومت اسرائیلی مفادات کے لیے مفید ہوسکتی تھی۔ اس کے ذریعے حماس کے سیاسی مخالفوں کو غزہ میں پاؤں رکھنے کی جگہ مل گئی۔ اس حکومت میں حماس کا ایک بھی ممبر نہیں تھا۔ رام اللہ میں موجود وزیراعظم، نائب وزرائے اعظم، وزیرخزانہ اور وزیرخارجہ وہی رہے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس نے ان تین شرائط کو پورا کرنا قبول کیا جو مغربی امداد کے لیے امریکا اور اس کے یورپی حلیف عائد کرتے رہے تھے، یعنی عدم تشدد، سابقہ معاہدوں کی پابندی اور اسرائیل کو تسلیم کرنا۔

اسرائیل نے نئی حکومت کو تسلیم کرنے کے امریکی فیصلے کی شدید مخالفت کی اور بین الاقوامی طور پر اسے تنہا کرنے کی کوشش کی۔ فلسطینی اتحاد کی طرف کسی چھوٹے قدم کو بھی ایک خطرہ سمجھتے ہوئے اسرائیلی سلامتی کے ذمہ دار مغربی کنارے اور غزہ کے درمیان کسی بھی تعلق پر معترض ہوتے ہیں کہ کہیں حماس مغربی کنارے میں بھی نظر نہ آنے لگے۔ دوسری طرف جو اسرائیلی دوریاستی حل کے مخالف ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ایک متحدہ فلسطینی قیادت کسی دیرپا امن کی لازمی شرط ہے۔

مفاہمتی حکومت کی مخالفت کے باوجود، اسرائیل فلسطینی اتھارٹی کے لیے ٹیکس جمع کرتا اور منتقل کرتا رہا اور اس نئی حکومت کے ساتھ سلامتی کے معاملات پر قریب رہ کر کام کیا۔ لیکن دو کلیدی معاملات: غزہ کے سرکاری ملازمین کو تنخواہوں کی ادایگی اور مصر کے ساتھ سرحد کھولنے کے بحران کو ناسور بننے دیا گیا۔ نئی حکومت کے قابلِ ذکر حمایتی، یعنی امریکا اور یورپ مصر کو آمادہ کرسکتے تھے کہ وہ سرحد پر پابندیاں نرم کرے اور اس طرح غزہ کے شہریوں پر ظاہر ہو کہ ان کی پریشانیوں کی اصل وجہ حماس کی حکومت رہی ہے لیکن انھوں نے یہ نہیں کیا۔ جب حماس نے اختیارات مغرب کی حامی ٹیکنوکریٹ حکومت کے سپرد کیے تو غزہ میں زندگی زیادہ مشکل ہوگئی۔ قطر نے غزہ کے سرکاری ملازمین کو

ادائیگی کی پیش کش کی، امریکا اور یورپ اس کو ممکن بنا سکتے تھے لیکن واشنگٹن نے انتباہ کیا کہ امریکی قانون کے تحت ان میں سے کسی ایک ملازم کو بھی ادائیگی کرنا منع ہے، جب کہ ان میں سے ہزاروں حماس کے ممبر نہیں ہیں۔ لیکن امریکی قانون کی نظروں میں ان سب نے ایک دہشت گرد تنظیم سے مادی فائدہ حاصل کیا۔ جب اقوام متحدہ کے نمایندے نے اس بحران کے حل کے لیے پیش کش کی کہ وہ تنخواہیں اقوامِ متحدہ کے ذریعے ادا کروا دے اور سب کسی قانونی ذمہ داری سے بچ جائیں تو اوباما انتظامیہ نے مدد نہیں کی، اور اسرائیل کے وزیرخارجہ کے ساتھ کھڑی رہی جس نے اقوام متحدہ کے نمایندے کو اس بنیاد پر ملک سے نکالنے کا مطالبہ کیا کہ وہ حماس کو رقم پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اب حماس ذمہ داریوں کی پُرامن منتقلی سے جو حاصل نہیں کرسکی اسے تشدد کے ذریعے حاصل کر رہی ہے۔ اسرائیل سابقہ حالات کو واپس لا رہا ہے جب غزہ میں بجلی مشکل سے آٹھ گھنٹے آتی تھی، پانی پینے کے قابل نہ ہوتا تھا، سیوریج سمندر میں ڈالا جارہا تھا، ایندھن کی کمی کی وجہ سے کارخانے بند ہوئے اور کوڑا کرکٹ گلیوں میں تیرنے لگا۔ علاج کے ضرورت مند مریض بھی ہسپتال میں نہ پہنچ سکے اور غزہ کے شہریوں نے، جس وقت مصر سرحد کھولتا تھا وہاں سے گزرنے کے لیے ۳ہزار ڈالر رشوت دی۔

اب صرف حماس کے حامیوں کے لیے ہی نہیں بلکہ غزہ کے شہریوں کے نزدیک بھی اس ناقابلِ قبول صورتِ حال کو بدلنے کے امکان کے لیے بم باری اور زمینی حملوں کا خطرہ مول لیا جاسکتا ہے۔ ایسی جنگ بندی جو تنخواہوں کا بحران حل نہ کرسکے اور مصر کا سرحدی راستہ نہ کھولے، قائم نہیں رہ سکتی۔ غزہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا سے کٹ کر رہے اور اس کے ملازم تنخواہوں کے بغیر کام کریں۔ ایک کھلے دل سے کی جانے والی جنگ بندی اسرائیلی وزیراعظم کے لیے سیاسی طور پر مشکل لیکن زیادہ دیرپا ہوگی۔ غزہ میں کارروائیوں میں موجودہ اضافہ اسرائیل اور مغرب کے فلسطینی مصالحت کے معاہدے کو نافذ ہونے سے روکنے کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ اس بحران سے نکلنے کا راستہ اس پالیسی کا ترک کرنا ہے۔ (انٹرنیشنل نیویارک ٹائمز، ۱۹ جولائی ۲۰۱۴ء، ترجمہ: مسلم سجاد)

دنیا کیوں خاموش ہے؟

خالد القزاز

چند دنوں میں، مَیں اپنی قید کے ۳۶۵ دن مکمل کرلوں گا جن میں سے نصف سے زائد قاہرہ میں، تورا قید خانے کے انتہائی حفاظت والے اسکارپین ونگ میں، قید تنہائی یا سخت پابندیوں میں گزرے۔ مَیں نے گذشتہ سال یہ سوچتے گزارا کہ مجھے کس چیز نے وہاں پہنچایا جہاں مَیں آج ہوں؟ میں اس بارے میں بھی سوچتا رہا ہوں کہ سیاست دانوں، انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والوں اور میڈیا کی میرے کیس کے بارے میں خاموشی کی وجہ کیا ہے؟

مَیں تعلیم کے لحاظ سے انجینیر اور پیشے کے لحاظ سے استاد ہوں۔ ۲۰۱۱ء کے انقلاب مصر کے بعد مجھے سیاست سے دل چسپی ہوئی۔ میں نے صدارتی مہم میں حصہ لیا اور پھر جولائی ۲۰۱۲ء میں مصر کے پہلے جمہوری منتخب صدر کے لیے خارجہ تعلقات کے سیکرٹری کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔

جب فوج نے صدر مرسی کی حکومت کو برطرف کیا تو اندازہ تھا کہ صدر اور اس کے معاونین کو بھاری قیمت چکانی ہوگی۔ مَیں نے اپنے آٹھ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ ہم ۳ جولائی ۲۰۱۳ء کو ان کی گرفتاری کے لمحے تک ان کے ساتھ انتظار کریں گے۔ نئے سیکرٹری دفاع کے احکامات پر ری پبلکن گارڈ کے سربراہ نے صدر مرسی اور ہم سب کو گرفتار کرلیا۔ مجھے اس کی توقع تھی لیکن جس چیز کی توقع نہیں تھی وہ وہ خاموشی تھی جو ہماری گرفتاریوں کے بعد رہی۔

صدر مرسی کے دورِ صدارت کے سال میں ہماری حکومت کے سرکاری دوروں میں یا عالمی کانفرنسوں میں بے شمار عالمی رہنماؤں سے رابطے رہے۔ صدر کے مترجم کی حیثیت سے مَیں نے تقریباً ہر ملاقات میں شرکت کی۔ ہم نے خطے میں امن کے لیے مغربی راہنماؤں اور ان کے

سفیروں کے ساتھ بہت قریب رہ کر کام کیا۔

شام اور مالی بھی وہ علاقے تھے جہاں ہم امن کا قیام چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ایک بڑے منصوبے پر کام کیا۔ ہم نے مصر کے لیے انسانی حقوق کا ایجنڈا طے کیا جس کو لے کر چلنے والا صدارتی دفتر تھا۔ اس نے اقوامِ متحدہ کو دعوت دی کہ قاہرہ میں مصر کے لیے یو این خواتین کا ہیڈکوارٹر کھولے۔ ہم نے ایک نئے مصر کی طرف پیش رفت کے لیے متعدد قانونی اصلاحات تجویز کیں۔ ہم مقامی اور عالمی سطح پر ان تمام افراد سے ملے جن سے ہم مل سکتے تھے اور جن کا اس میں کوئی حصہ ہوسکتا تھا تا کہ اس ایجنڈے کو آگے بڑھائیں۔

اس سرگرمی اور ان روابط کی وجہ سے مَیں نے جولائی ۲۰۱۳ء میں اپنی گرفتاریوں پر عالمی برادری کی خاموشی کو سمجھنے کی بہت کوشش کی۔ جب فوج نے مرسی حکومت کو برطرف کیا تو ہمارے عالمی ساتھیوں میں سے کوئی بھی ہمارے لیے کھڑا نہ ہوا۔ بیش تر کے لیے ایسا تھا جیسے کہ ہم کبھی تھے ہی نہیں۔ خاموشی اتنی تھی کہ مَیں اپنے ساتھیوں سے مذاق کرتا تھا کہ ہم واقعی زندہ بھی ہیں؟

جب ہیومن رائٹس واچ نے دسمبر میں بیان جاری کیا جس میں ہمارے جبری طور پر لاپتا ہونے کی تفصیل بیان کی گئی تھی تو ہم نے اپنے آپ کو پھر زندہ محسوس کیا، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دو سینیر ساتھی، یعنی صدر کے اسسٹنٹ اور مشیروں میں سے ایک نے بغیر کسی قانونی کارروائی کے اپنے کو صدر کے ساتھ ملزموں میں پایا۔ مجھے ایک انتہائی محفوظ قیدخانے میں فضول قسم کے الزامات کے تحت بھیج دیا گیا۔ میری یہ تحریر بھی میرے خلاف جوابی الزامات کا سبب بن سکتی ہے۔

میرے ساتھ یہ سلوک اس نمایندگی کی وجہ سے کیا جارہا ہے جو میں کرتا ہوں۔ مَیں ایک ایسے عالمی منظرنامے کی نمایندگی کرتا ہوں جو تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان حقیقی تبادلے کی اساس پر تعمیر کیا گیا ہے۔ میں ایک ایسی نسل کا نمایندہ ہوں جو سرحدوں سے ماورا ہے، جو عالمی برادری میں رہتا ہے، جو غیر جمہوری اداروں کی پابندیوں کی مزاحمت کرتا ہے۔ میں تین براعظموں میں رہتا ہوں۔ ایشیا میں (میرا بچپن متحدہ عرب امارات میں گزرا)، شمالی امریکا میں (کالج اور بعد کی تعلیم کے لیے میں کینیڈا گیا) اور افریقہ میں (مصر اپنے آبائی وطن میں)۔ میری اہلیہ کینیڈین ہیں اور ہمارے چار بچے مصری کینیڈین ہیں۔ میں مسلمان ہوں جو دوسرے مذاہب اور ثقافتوں کے ساتھ

اختلاف سے زیادہ مشترک اُمور دیکھتا ہے۔ میں کینیڈا کو رواداری اور کثیرثقافتی زندگی کا ایک ماڈل سمجھتا ہوں۔ میں امریکا اور یورپ کو سائنس اور ایجادات کا مرکز اور عالمی امن کا نمایندہ سمجھتا ہوں اس شرط کے ساتھ کہ ان کی خارجہ پالیسی زیادہ بااصول ہو۔ میں ایشیا کو سائنسی ترقی میں ایسی اقدار کے ساتھ جو ہم سب کو بہت کچھ دے سکتی ہیں عالمی مسابقت کار سمجھتا ہوں۔ مَیں شرقِ اوسط کو تہذیبوں کے نقطۂ اتصال کی حیثیت سے دیکھتا ہوں جہاں انسانی رواداری اور باہمی امن کی بنیاد پر دیرپا امن ہمیشہ کے لیے یادگار ہوسکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ صدی گذشتہ صدیوں سے مختلف ہوگی۔ عالمی شہری زیادہ باحیثیت اور بااختیار ہوں گے اور ہماری خرابیوں کے لیے سیاست دانوں کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔

ہمیں مل کر خواب دیکھنا چاہیے۔ کچھ خواب سچّے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ہم نے ایک ایسے آمر کا تختہ اُلٹ دیا جو ۳۰ سال سے اقتدار کا مالک تھا۔ یہ اس وقت ممکن ہوا جب ۲۵ جنوری ۲۰۱۱ء کو پانچ افراد تحریر اسکوائر میں جمع ہوئے اور انھوں نے تمام مصریوں سے کہا کہ وہ آزادی، انصاف اور عزت کے پرچم تلے ان کے ساتھ آجائیں۔ یہ تحریک تھی جس نے مجھے ۲۰۱۲ء کے انتخابات میں مہم کے ایک رضاکار کے طور پر کام کرنے کا جذبہ دیا تھا۔

آج میرے خوابوں کو اس سوال نے حسرت سے دوچار کر دیا ہے۔ انسانیت کے رشتے سے میرے بھائیو اور بہنو! مَیں جانتا ہوں کہ مصری فوجی حکومت میری مکمل 'خاموشی کیوں چاہتی ہے، مگر براہِ مہربانی مجھے اس سوال کا جواب دیجیے: آپ میرے بارے میں اتنے خاموش کیوں ہیں؟ (خالد القزاز کی یہ تحریر ان کے قیدخانے سے خفیہ طور پر حاصل کی گئی)۔ (انٹرنیشنل نیویارک ٹائمز، ۲۸ جون ۲۰۱۴ء، ترجمہ: مسلم سجاد)

ترکی: اُردگان کی کامیابی اور درپیش چیلنج

ارشاد الرحمٰن

۱۰؍اگست ۲۰۱۴ء کو ترکی میں منعقد ہونے والے صدارتی انتخابات میں وزیراعظم ترکی رجب طیب اردگان ملک کے صدر منتخب ہوئے۔ اب تک صدر کا انتخاب پارلیمنٹ کرتی رہی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب قوم نے براہِ راست اپنے ووٹ سے صدر کا انتخاب کیا ہے۔ رجب طیب اردگان کو پہلے ہی راؤنڈ میں اپنے حریفوں پر فیصلہ کُن برتری حاصل ہوگئی اور دوسرے راؤنڈ کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ملکی دستور کی دفعہ ۴ کے مطابق ملک کے صدارتی انتخابات میں اردگان کو مطلق اکثریت حاصل ہے۔ اردگان کو ۵۲ فی صد، اکم الدین احسان اوغلو کو ۳۸ فی صد اور صلاح الدین دمیر طاش کو ۹ فی صد ووٹ حاصل ہوئے۔ عالمی ذرائع ابلاغ کے مطابق رجب طیب اردگان اس وقت اپنی سیاسی زندگی کے بلند ترین مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ وہ ۲۰۰۳ء سے ملک کے وزیراعظم تھے۔ وہ ملک کے صدر بن کر صدر جمہوریہ کے اختیارات کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ ذرائع نے یہ تبصرہ بھی کیا ہے کہ اردگان اپنی زندگی کے جس اہم ترین ہدف تک پہنچنا چاہتے تھے وہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ صدارتی منصب کو اعزازی کے بجاے تنفیذی صورت عطا کی جائے۔

عالمی ذرائع ابلاغ میں بہت اہم خبررساں اداروں کے تبصروں کے مطابق عراق، شام اور یوکرائن کے بحرانوں میں گھرے ہوئے اور مغرب کے نہایت اہم حلیف اور اتحادی ملک ترکی کا آیندہ صدر انتہائی اہمیّت کے حامل کثیر جہتی سیاسی مقام پر کھڑا ہوگا۔ اگر مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے تناظر میں دیکھا جائے تو ترکی کے صدارتی انتخابات کو تبدیلی کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ برطانوی اخبار دی گارڈین کے مطابق اردگان کی یہ نمایاں کامیابی اُس کی طاقت و اقتدار کو

مزید مستحکم کرے گی۔ بیش تر تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ وزارتِ عظمیٰ کے پورے عرصے میں اردگان کے لیے یہ مشکل ترین سال تھا جو اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔

شخصیت، تجربے اور سیاسی بصیرت و قومی سطح پر حاصل شہرت و پذیرائی کے اعتبار سے تینوں صدارتی اُمیدواروں کی حیثیت میں بہت نمایاں فرق ہے۔ صلاح الدین دمیرطاش ۴۱ سال کے ہیں، ملک کی بہت بڑی قبائلی برادری کُردوں کی حمایت انھیں حاصل تھی۔ اندازے سے بہت کم شرح ووٹ ان کے حصے میں آئی، یعنی ۹ فی صد۔ دوسرے صدارتی اُمیدوار او آئی سی کے سیکرٹری جنرل کے منصب پر رہنے کی وجہ سے عالمی شہرت و تعارف رکھتے تھے اور ملک کی ۱۳ سیاسی جماعتوں کے متفقہ اُمیدوار تھے۔ اس تمام تر حمایت کے باوجود انھیں ۳۸ فی صد ووٹ ملے۔ اردگان کے مقابلے میں لوگ انھیں 'باباجی' خیال کرتے ہیں۔ تنقید و تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ رجب طیب اردگان ۶۰ سال کی عمر میں بھی پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ قوتِ کار اور حاضر دماغی کے اعتبار سے بہت اچھا تعارف رکھتے ہیں۔ حکومت میں ۱۲ برس گزارنے کے بعد بھی وہ توانا عزم اور تعمیر و ترقی کے منصوبوں کو مزید آگے بڑھانے کے متمنی ہیں۔ ناقدین کے نزدیک اس کے باوجود وہ منصبِ صدارت پر متمکن ہو کر ترکی کی سیاست کے نقشے میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکیں گے۔ حامی انھیں 'فرزندِ اُمت' کا نام دیتے ہیں اور حریف انھیں مذاق سے 'سلطان' کہتے ہیں۔ بہرحال اردگان اپنے دونوں حریفوں کے مقابلے میں پوری قوم کا اعتماد حاصل کرنے میں واضح طور پر کامیاب رہے اور ۵۲ فی صد سے زائد ووٹ حاصل کر کے ملک کے پہلے جمہوری صدر منتخب ہو گئے۔ بعض ذرائع نے انھیں ترکی کی تاریخ کا مضبوط ترین لیڈر قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بطور صدر وہ متعدد قومی اداروں میں اپنے پسندیدہ افراد کو متعین کرنے کا اختیار حاصل کرلیں گے۔

رجب طیب اردگان کی صدارتی انتخابات میں کامیابی، اُن کی اپنی قائم کردہ جماعت 'انصاف و ترقی پارٹی' کی مسلسل ۹ویں کامیابی ہے۔ ۱۹۲۳ء سے لے کر اب تک سیاسی منظرنامے پر کسی بھی جماعت کو ایسی برتری حاصل نہیں ہوسکی۔ انصاف و ترقی پارٹی تین بار عام انتخابات میں، تین بار بلدیاتی انتخابات میں، دو بار ریفرنڈم میں اور اب پہلے براہِ راست قومی صدارتی انتخابات میں کامیابی کی منزلیں طے کر چکی ہے۔

۱۲ سال سے انصاف وترقی پارٹی سیاسی منظر پر نہ صرف موجود ہے بلکہ برسرِ اقتدار ہے۔ پارٹی نے خارجی سطح پر عالمی تبصرہ و تجزیہ نگاروں کے لیے قابلِ توجہ ڈپلومیسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ترکی نے علاقائی و عالمی مقام حاصل کرلیا ہے۔ اردگان کو عالمِ عرب اور عالمِ اسلام میں جو پذیرائی ملی ہے اس سے قبل کسی سیاسی رہنما کو حاصل نہیں ہوسکی۔ انصاف وترقی پارٹی کے دورِ حکومت میں ترکی متعدد بار قابلِ ذکر اقتصادی کامیابیوں کی منزلیں طے کرچکا ہے۔ ایسی مملکت جو قرضوں اور بحرانوں کے بوجھ تلے دبی ہو، وہ قرضوں کے جان لیوا بوجھ سے باہر نکل آئے تو یہ عالمی سطح پر بے مثال کامیابی ہے۔ وزیراعظم رجب طیب اردگان نے صدارتی انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے خطاب میں کہا: ترکی عالمی مالیاتی فنڈ کا ۲۳ ملین ڈالر کا مقروض تھا جن کی مکمل ادایگی کے بعد وہ مالیاتی فنڈ کے قرضوں سے نجات پاچکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترکی یہ عزم رکھتا ہے کہ عالمی مالیاتی فنڈ کو ۵ ملین ڈالر کا قرض دے کر وہ مقروض ملکوں کی صف سے نکل کر قرض دینے والا ملک بن جائے۔ عالمی طاقتوں کی ہدایات کے تابع رہنے کے بجاے عالمی سیاست میں برابر کے شریک کی حیثیت سے کردار ادا کرسکے۔

طیب اردگان ایسی شخصیت ہیں جس نے ترکی کے گلی کوچوں میں خود کو موضوعِ بحث بنالیا ہے۔ ان کے گرد جمع ترک محبت کرنے والے بھی ہیں اور نفرت کرنے والے بھی۔ ان کے عقیدت مند انھیں اتاترک ثانی سمجھتے ہیں۔ ان کے نقاد کہتے ہیں کہ وہ خطے کو تقسیم کرنے اور اس پر تسلط جمانے کے منصوبے کے آلۂ کار ہیں۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ وہ عثمانی سلطنت کے شاہوں جیسا 'شاہ' بننا چاہتے ہیں لیکن ان کا یہ خواب اس لیے پورا نہیں ہوسکتا کہ اتاترک نے جو ریاست کا بانی ہے، دستور میں ایسی دفعہ شامل کر رکھی ہے جس کی بنیاد پر ریاست کا سیکولر رہنا ناگزیر ہے۔

اتاترک نے اس دفعہ کے فوراً بعد یہ دفعہ بھی شامل کی ہے کہ سیکولرزم کی اس دفعہ کو کسی بھی وقت اور کسی بھی ذریعے سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ اردگان کے پیشِ نظر خلافتِ عثمانیہ جیسی ریاست قائم کرنا ہے لہٰذا اس دفعہ کی موجودگی تک یہ نہیں ہوسکتا۔ ترکی دستور میں دینی جماعتوں کی تشکیل ممنوع ہے۔ انصاف وترقی پارٹی دستاویزی اور کاغذی لحاظ سے سیکولر اور مزاج وطبیعت اور کردار کے اعتبار سے اسلامی ہے۔

پے در پے تین قومی انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے یک جماعتی حکومت کی تشکیل کے باوجود یہ ممکن نہیں تھا کہ معاملہ ان کے ہاتھ میں آجاتا۔ ملک پر فوج کا تسلط قائم تھا اور وہ کسی وقت بھی ان کے خلاف بغاوت کر سکتی تھی۔ لہٰذا اردگان نے پہلے فوج کے اثرات و اختیارات کو محدود کیا، پھر عدلیہ کی اتھارٹی کا خاتمہ کیا جو اسلامی گروپوں کے سر پر لٹکتی تلوار تھی۔ اردگان نے یورپی یونین کے قوانین کے ساتھ انضمام کو غنیمت جانا تا کہ رفتہ رفتہ اُن قوانین کو تبدیل کیا جاسکے جو ان دونوں اداروں سے متعلق تھے۔

انصاف و ترقی پارٹی کے نائب صدر محمد علی شاہین نے دستوری تبدیلیوں کے حوالے سے کہا کہ ایک مدت سے ہماری رائے ہے کہ ۱۹۸۲ء کے دستور میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور قوم کو نئے دستور کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ دستوری تبدیلیوں کے مسودے پر دو سال کی محنت کے باوجود پارلیمنٹ سے دستوری کمیٹی کا اتفاق نہیں ہوسکا۔ مگر اس کے باوجود ہم اپنی رائے پر قائم ہیں اور اپنے مقاصد اور اہداف کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

۲۰۱۵ء میں منعقد ہونے والے قومی انتخابات میں پیش کیے جانے والے منشور میں ہمارا سب سے اہم وعدہ یہی ہوگا کہ نیا دستور اتفاق رائے سے بنے گا۔ ہمارا یقین ہے کہ ملک کو ایسے دستور کی ضرورت ہے جس سے ملکی مشکلات و مسائل کا حل ممکن ہو، جو انسانی حقوق اور آزادیوں کا ضامن ہو اور ترکی کو ایک جدید ریاست بنا سکے۔

رجب طیب اردگان نے بذاتِ خود ترکی کے اندر پارٹی قیادت کو یہ ہدف دیا ہے کہ وہ آیندہ پارلیمانی انتخابات میں اتنی غالب اکثریت حاصل کریں جس سے پارٹی کے لیے دستور میں تبدیلی لانے کا عمل ممکن ہوسکے۔ انھوں نے یہ بات بھی واضح کی کہ آیندہ عام انتخابات میں پارٹی کی شرکت کا مقصد دستور میں تبدیلی کی خاطر زیادہ سے زیادہ اکثریت حاصل کرنا ہے۔ گذشتہ انتخابات میں اگرچہ پارٹی کو ۵۵۰ کے ایوان میں ۳۱۳ نشستیں حاصل تھیں لیکن وہ غالب اکثریت رکھنے کے باوجود دستور میں تبدیلی کے لیے مطلوبہ دوتہائی اکثریت نہیں رکھتی تھی۔

اردگان کی صدارتی کامیابی پر مخالفین کا اعتراض ہے کہ وہ ملک کو صدارتی نظام میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اردگان نے اس رائے کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ میں کسی امتیاز کے بغیر ۷۷ ملین

ترک عوام کا صدر ہونے کا حلف اُٹھاؤں گا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے تاریخی اصلاحات اس لیے کی ہیں کہ ملک کے تمام شہری آزادیِ رائے کا حق کسی خوف و خطر کے بغیر استعمال کرسکیں۔ اس کے برعکس اُن کے حریفوں کا خیال ہے کہ ترکی کو مغربی اقدار و روایات سے بہت دُور لے جارہے ہیں۔
اردگان کو درپیش چیلنجوں میں ایک بہت بڑا مسئلہ معروف دانش ور فتح اللہ گولن کی قابلِ اعتراض سرگرمیاں ہیں۔ ان کے بارے میں اردگان نے کہا کہ میرے منصبِ صدارت سنبھالنے سے گولن سے کش مکش میں اضافہ ہوجائے گا۔ اُن کا کہنا ہے کہ گولن صرف اردگان اور اس کے خاندان اور ساتھیوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ ترکی اور ترک قوم کی آزادی کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔

انصاف و ترقی پارٹی کا کہنا ہے کہ سیاسی کش مکش اور چیز ہے اور تخریبی کش مکش دوسری چیز۔ فتح اللہ گولن کی پارٹی پر انصاف پارٹی کا الزام ہے کہ وہ قومی اداروں کے اندر انتشار و انارکی پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ترکی ریاست کے خلاف مجرمانہ کارروائیوں میں ملوث پائے گئے ہیں۔ ملک کی قومی اور وطنی سلامتی کے اہم رازوں کی جاسوسی کرتے پکڑے گئے ہیں۔ وہ ان معلومات اور سربستہ رازوں کو ترکی کے دشمنوں تک پہنچاتے ہیں۔ ابتدا میں جب وہ حکومت کے سیاسی طور پر مخالف رہے تو اُن سے بالکل تعرض نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ دستوری حقوق حاصل کیے بغیر سیاسی پلیٹ فارم پر اختلافی سیاست کرتے رہے۔ انھوں نے کوئی سیاسی جماعت رجسٹر نہیں کرائی تھی جس کے ذریعے وہ حکومت کی مخالفت کرسکتے۔ ان پر دوسرا الزام یہ ہے کہ انھوں نے 'مرمرہ' بحری جہاز کے مسئلے پر اسرائیلی حکومت کی تائید کی اور ترکی حکومت کو اُن ۹ شہدا کی شہادت کا ذمہ دار قرار دیا جنھوں نے غزہ میں فلسطینی قوم کے گرد اسرائیلی محاصرے کو توڑنے کی خاطر جامِ شہادت نوش کیا۔ یہی وہ موقع ہے جب ترکی حکومت نے اُن کا محاسبہ کرنا چاہا۔ تیسرا الزام یہ ہے کہ فتح اللہ گولن کی جماعت کے کارکن خفیہ طور پر قومی حکومتی اداروں میں جاسوسی نظام قائم کر کے عسکری اور سول حکومتی اداروں کی سلامتی کو خطرے سے دوچار کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ترکی سلامتی کونسل کے اجلاسوں کی جاسوسی کی اور ان خفیہ معلومات کو عام کیا۔

ترکی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر کئی مشکلات اور چیلنجوں سے دوچار ہے اور رجب طیب اردگان نے ان تمام مسائل و مشکلات کو نقطۂ نظر صفر پر لانے کا عزم ظاہر کیا تھا مگر ۱۲ سال

مسلسل اقتدار میں رہنے کے بعد بہت سے اُمور و معاملات سے پردہ اُٹھا تو وہ مشکل تر ہوتے گئے۔ داخلی سطح پر اردگان کو سیکولر قوتوں سے سابقہ ہے جو اپنے مقاصد اور اہداف سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہتیں، جب کہ اسلامی روحانیت ترکی کو اس کی تہذیب و ثقافت کی طرف لوٹانا چاہتی ہے۔ ملکی امن و امان کے قیام اور اس پر صرف ہونے والے قومی سرمایے کی شرح کو کم سے کم کرنا بھی بہت بڑا چیلنج ہے۔ شام، مصر، عراق وغیرہ کے مسائل ترکی حکومت اور معیشت پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ ملک کے اندر قبائلی تحریکیں بھی ہنگاموں اور فسادات کو ہوا دینے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتیں۔ ان تمام اندرونی و بیرونی مسائل کے باوجود، انصاف و ترقی پارٹی کی بلدیاتی انتخابات اور صدارتی انتخابات میں نمایاں اور واضح تر کامیابی سے قومی رجحان اور میلان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُمید ہے کہ قوم دستوری تبدیلیوں کو یقینی بنانے کے لیے انصاف و ترقی پارٹی کو ۲۰۱۵ء کے پارلیمانی انتخابات میں پہلے سے مضبوط تر عوامی مینڈیٹ دے کر پارلیمنٹ میں پہنچائے گی۔ غالب اُمید ہے کہ رجب طیب اردگان بحیثیت صدر ریاست ان تمام اُمور و وسائل سے نبردآزما ہونے میں کامیاب ہوں گے۔ ان کا کامیاب ماضی اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ وہ ایسی شخصیت ہیں جس کو معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ اپنے ایجنڈے پر پوری یک سوئی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

آیندہ انصاف و ترقی پارٹی اپنے اہداف حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہتی ہے، پارٹی مقبولیت سے تو اس کے امکانات روشن نظر آتے ہیں مگر ناقدین کا کہنا ہے کہ اردگان کے پارٹی سربراہ نہ رہنے کی وجہ سے اُن کی پارٹی پر گرفت کمزور ہو جائے گی۔ پارٹی کے بدخواہوں نے پارٹی کے اندر عبداللہ گل دھڑے کا وجود بھی دریافت کرلیا ہے۔ یہ اندازے اور افواہیں انصاف و ترقی پارٹی کا سفر کھوٹا کرنے کی سازشیں ہیں۔ اُمید ہے کہ پارٹی کے داخلی نظام میں ہونے والی تبدیلی پارٹی قیادت اور قومی حکومت کے لیے مزید تقویت کا باعث بنے گی۔ غالب امکان ہے کہ ترکی وزیرخارجہ احمد داؤد اوغلو جو عالمی اُمور میں اردگان کے دستِ راست کی حیثیت رکھتے ہیں اور پارٹی کے داخلی نظام میں بھی مضبوط شخصیت ہیں، پارٹی سربراہ بنا دیے جائیں اور وہی ملک کے وزیراعظم بھی ہوں۔ اس کے ساتھ سابق وزیرٹرانسپورٹ بن علی یلدریم بھی اس منصب کے اُمیدوار ہو سکتے ہیں۔

افغانستان کے صدارتی انتخابات

ڈاکٹر محمد اقبال خلیل

۲۰۱۴ء افغانستان کے لیے بہت اہمیّت کا حامل ہے۔ امریکی صدر اوباما کے اعلان کے مطابق دسمبر ۲۰۱۴ء میں امریکی و دیگر ناٹو افواج افغانستان سے واپس چلی جائیں گی، البتہ چند ہزار پر مشتمل لڑاکا فوج اور فضائیہ پانچ عسکری اڈوں پر باقی رہ جائیں گی۔ ملکی امن و امان قائم رکھنے کا سارا اختیار اور ذمہ داری افغان نیشنل فورس اور پولیس کے حوالے کر دی جائے گی اور غیر ملکی فوج کا کردار محدود ہوگا۔ تاہم طالبان کی واپسی کے خدشے کے پیش نظر امریکی فوج افغانستان میں ایک طویل عرصے کے لیے موجود رہے گی۔ امریکی فوج کی موجودگی کو قانونی شکل دینے کے لیے ضروری ہے کہ کابل میں افغان حکومت کے ساتھ امریکی حکومت کا ایک معاہدہ ہو۔ موجودہ صدر حامد کرزئی نے امریکی دباؤ کے باوجود اس معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہ کام آیندہ منتخب حکومت کے ذمے کر دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو امریکیوں کے ساتھ اس معاہدے پر دستخط کر دے۔ لیکن امریکی پریشانی میں اس وقت تازہ اضافہ صدارتی انتخابات کے دوسرے مرحلے کے نتائج کے معلق ہونے سے ہوا۔ افغان الیکشن کمیشن نے جب دوسرے مرحلے کے غیر حتمی نتائج کا اعلان کیا تو تمام بین الاقوامی مبصرین حیران رہ گئے کہ ڈاکٹر اشرف غنی نے ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ سے ۱۰ لاکھ سے زائد ووٹ حاصل کیے جو ایک حیران کن معاملہ تھا۔ اس لیے عبداللہ عبداللہ نے فوری ردعمل ظاہر کرتے ہوئے یہ نتائج ماننے سے انکار کر دیا اور احتجاجی تحریک چلانے اور متوازی حکومت بنانے کا اعلان کیا۔

پہلے مرحلے کے صدارتی انتخاب، جو اس سال ۲۰ ؍اپریل میں مکمل ہوئے تھے، کے نتائج کے مطابق اول نمبر پر ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ آئے تھے۔ انھوں نے ۴۵ فی صد تقریباً ۳۰ لاکھ ووٹ

حاصل کیے تھے، جب کہ دوسرے نمبر پر ڈاکٹر اشرف غنی نے ۳۱ء۶ فی صد، یعنی تقریباً ۲۱ لاکھ ووٹ لیے تھے جو عبداللہ عبداللہ سے ۹ لاکھ کم تھے۔ زلمے رسول نے تیسری پوزیشن ۱۱ء۴، یعنی ساڑھے سات لاکھ ووٹ لیے۔

پروفیسر عبدالرب رسول سیاف نے ۷ء۳ فی صد، یعنی ۴ لاکھ ۶۵ ہزار، انجینئر قطب الدین ہلال نے ۲ء۸ فی صد، یعنی ایک لاکھ ۸۰ ہزار، جب کہ چھٹے نمبر پر گل آغا شیرازی نے ۱ء۶ فی صد، یعنی ایک لاکھ ووٹ لیے تھے۔ ان میں سے زلمے رسول، استاد سیاف اور گل آغا شیرازی نے ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کی دوسرے مرحلے میں حمایت کا اعلان کیا تھا۔ اس لیے اس کی جیت یقینی نظر آرہی تھی۔ لیکن دوسرے مرحلے میں پانسہ پلٹ گیا اور ابتدائی مرحلے کے نتائج ہی میں ڈاکٹر اشرف غنی سبقت لے گئے۔ انھوں نے غیر حتمی نتائج کے مطابق ۴۴ لاکھ ۸۵ ہزار ووٹ حاصل کیے، جب کہ عبداللہ عبداللہ نے ۳۴ لاکھ ۶۱ ہزار ووٹ لیے۔ اس طرح احمد زئی قبیلے سے تعلق رکھنے والے پختون اُمیدوار ڈاکٹر اشرف غنی بھاری اکثریت سے کامیاب نظر آئے، جب کہ تاجک پس منظر کے حامل ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ شکست کھا گئے۔ لیکن انھوں نے اس شکست کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بڑے پیمانے پر انتخابی دھاندلی کا الزام لگایا۔ مبصرین نتائج کی اس تبدیلی میں موجودہ صدر ڈاکٹر حامد کرزئی کا کردار تلاش کر رہے ہیں جس نے قسم کھائی تھی کہ عبداللہ کو عرق (صدارتی محل) میں گھسنے نہیں دوں گا۔ اس نے پہلے مرحلے میں بھی ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کو ہرانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اس مقصد میں اس حد تک اس کو کامیابی ملی کہ ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ پہلے مرحلے میں ۵۰ فی صد ووٹ حاصل کرنے کا ہدف حاصل نہ کر سکے، جب کہ وہ اس کے قریب پہنچ چکے تھے اور اگر اُمیدواروں کی تعداد کم ہوتی تو شاید وہ بہ آسانی یہ ہدف حاصل کر چکے ہوتے۔

کہا جاتا ہے کہ حامد کرزئی نے کئی اُمیدواروں کو کھڑا کروا کر یہ مقصد حاصل کیا۔ پھر دوسرے مرحلے میں براہ راست مقابلہ پختون اور تاجک اُمیدوار کا ہوا۔ قومی تعصبات نے اس مرحلے میں خوب رنگ جمایا اور رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم نظر آئی۔ جن نتائج کا اعلان ہوا ہے اگر ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پختون اکثریت آبادی رکھنے والے صوبوں میں ڈاکٹر اشرف غنی کو ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے کامیابی نصیب ہوئی۔

اس نے کل ۱۸ صوبوں میں الیکشن جیتا جن میں پکتیا، پکتیکا، خوست، ننگر ہار، کنٹر، لغمان، قندوز، ہلمند، زابل اور ارزگان جیسے پختون ولایتوں میں لاکھوں ووٹ حاصل کیے، جب کہ عبداللہ عبداللہ چند ہزار تک محدود رہے۔ سب سے دل چسپ نتیجہ صوبہ قندھار کا ہے جہاں سے عبداللہ عبداللہ کا آبائی تعلّق ہے، وہاں ڈاکٹر اشرف غنی نے ۲لاکھ ۶۸ ہزار ووٹ حاصل کیے، جب کہ ڈاکٹر عبداللہ کو صرف ۵۱ ہزار ووٹ ملے۔ ڈاکٹر اشرف غنی کے ساتھ اول نائب صدر کے طور پر جنرل رشید دوستم اُمیدوار تھے جو ازبکوں کے نمایندہ اور مسلمہ رہنما مانے جاتے ہیں۔ اس لیے ان صوبوں میں بھی ڈاکٹر اشرف غنی کا پینل کامیاب ہوا جن میں جوز جان، فریاب اور نمروز وغیرہ شامل ہیں، جب کہ ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کو تاجک ووٹوں کی بھاری اکثریت ملی، جن کی آبادی افغانستان میں ۲۷ فی صد تک سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح ہزارہ کے ووٹ بھی زیادہ ان کو ملے۔ جن صوبوں میں ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کو واضح اکثریت ملی ان میں کپیسا، پروان، غزنی، بدخشان، تخار، بغلان، سمنگان، بلخ، ہرات، نمروز، بامیان، پنجشیر، ڈایکنڈی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی کل تعداد ۱۶ ہے۔

مرکزی صوبے کابل میں ڈاکٹر اشرف غنی نے ۴لاکھ ۵۴ ہزار ووٹ حاصل کیے، جب کہ ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ نے ۴لاکھ ۲۲ ہزار ووٹ لیے، یعنی مقابلہ تقریباً برابر رہا۔ ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ نے انتخابی دھاندلیوں کے جو الزام لگائے اس میں جعلی ووٹ، ایک ووٹر کے ووٹ کا کئی بار استعمال اور مخصوص حلقوں اور پولنگ اسٹیشنوں پر یکطرفہ ووٹنگ وغیرہ شامل ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ دونوں اُمیدواروں نے جہاں موقع ملا وہاں خوب دھاندلی کی۔ پہلے مرحلے میں پختون اکثریت کے کئی صوبوں میں طالبان کے خوف سے ووٹنگ کی شرح بہت کم تھی لیکن اس بار وہاں لاکھوں ووٹ پول ہوئے۔ اس کی ایک وجہ طالبان کی ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ سے دشمنی بھی بتائی جاتی ہے لیکن وہ دونوں اُمیدواروں کو امریکی گماشتے تصور کرتے ہیں اور سرے سے پورے انتخابی عمل کو ماننے سے انکاری ہیں۔ اس لیے اس کا امکان کم ہے کہ انھوں نے عبداللہ عبداللہ کی مخالفت میں ڈاکٹر اشرف غنی کو ووٹ دینے کی حمایت کی ہوگی۔ ان صوبوں میں ووٹوں کے رجسٹریشن کی شرح بھی خاصی کم تھی۔ اس لیے دھاندلی کے امکانات کو تقویت ملتی ہے۔

تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کے احتجاج کا امریکا نے سنجیدگی سے

نوٹس لیا۔ اس سے پہلے ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں بھی ڈاکٹر عبداللہ نے حامد کرزئی پر بدترین دھاندلی کے الزامات لگائے تھے، بلکہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں دوسرے مرحلے میں وہ یہ کہہ کر انتخابات سے دستبردار ہوگئے تھے کہ حامد کرزئی کی موجودگی میں شفاف انتخابات ممکن ہی نہیں۔ اب حامد کرزئی کی جگہ ڈاکٹر اشرف غنی نے لے لی اور ایک بار پھر عبداللہ عبداللہ دھاندلی کا شکار ہوگئے۔

امریکی وزیرخارجہ جان کیری نے اس ماہ دومرتبہ کابل کا دورہ کیا اور دونوں صدارتی اُمیدواران کا موقف سننے کے بعد ان کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب رہے۔ دوسری بار کابل کے دورے میں وہ ان دونوں اُمیدواران کے درمیان ایک معاہدہ کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ جس کا باقاعدہ میڈیا میں اعلان کیا گیا اور دونوں رہنماؤں نے اس پر اتفاق کیا کہ ایک ایسا مصالحتی کمیشن بنایا جائے جو ایک قومی حکومت کا قیام ممکن بنائے۔ دونوں نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ دونوں طرف سے مقرر کردہ مبصرین کی موجودگی میں سارے ووٹ دوبارہ شمار کیے جائیں جس کو آڈٹ کا نام دیا گیا اور مشکوک ووٹوں کو گنتی سے نکال باہر کیا جائے۔ اس دوبارہ گنتی کے نتیجے میں جو اُمیدوار اکثریت حاصل کرے وہ صدر بن جائے گا اور دوسرا اُمیدوار اس کے ساتھ نائب صدر اول بنے گا۔ اس طرح ایک مخلوط حکومت کابل میں اقتدار سنبھالے گی۔ آزاد الیکشن کمیشن کے تحت ووٹوں کی دوبارہ گنتی اور آڈٹ کا کام شروع ہوگیا ہے۔ دونوں جانب کے مقرر کردہ مبصرین اس عمل میں شریک ہیں۔ یہ ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس عمل سے گزرنے کے بعد بھی ڈاکٹر اشرف غنی ہی کامیاب ٹھیریں گے کیونکہ ان کو ۱۰لاکھ ووٹوں کی سبقت حاصل ہے۔ پہلے دوتین دن جو کام ہوا اس میں ۸۵ ہزار ووٹوں کو مسترد کر دیا گیا لیکن اس میں اگر زیادہ ووٹ ڈاکٹر اشرف غنی کے ضائع ہوئے تو ۳۰ ہزار ووٹ عبداللہ کے بھی گئے۔ البتہ ڈاکٹر اشرف غنی کو جو بڑی سبقت حاصل ہے، اس میں خاطرخواہ کمی واقع ہوگی۔

ڈاکٹر اشرف غنی احمد زئی بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہر اقتصادیات ہیں۔ انھوں نے کولمبیا یونی ورسٹی امریکا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور کئی امریکی یونی ورسٹیوں میں پڑھاتے رہے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں ورلڈ بنک میں ملازمت اختیار کی۔ اس دوران انھوں نے کئی ممالک بشمول چین اور روس میں خدمات سرانجام دیں اور اپنی ذہانت اور مہارت کا لوہا منوایا۔

۲۰۰۱ء میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد وہ افغانستان واپس آئے اور حکومت میں شامل ہوئے۔ وہ شروع میں صدر حامد کرزئی کے مشیر خاص تھے اور بون معاہدے پر عملدرآمد اور لویہ جرگہ کی تشکیل میں ان کا اہم کردار رہا۔ پھر وہ وزیر خزانہ بن گئے اور افغانستان کی معاشی ترقی، نئی افغان کرنسی کے اجرا، سالانہ بجٹ کی تیاری اور مالی ضابطوں کی پابندی میں نام کمایا۔ انھوں نے بین الاقوامی ڈونرز ایجنسیوں کا اعتماد حاصل کیا۔ خود احتسابی اور کرپشن کے خلاف سخت کارروائیاں ان کی وجہ شہرت ہیں۔ بعد میں انھوں نے کابل یونی ورسٹی میں ایک ادارہ 'مؤثر ریاستی انسٹی ٹیوٹ' قائم کیا جس نے بہت جلد عالمی شہرت حاصل کی۔ یہ ایک منفرد ادارہ تھا جو کمزور اقتصادی ممالک کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے حکمت عملی بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ دیہات کی سطح پر ترقی کا منصوبہ اور ویلج کونسل کا قیام بھی ان کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ۲۰۰۸ء کے الیکشن کے بعد وہ افغان کابینہ کا حصّہ نہ بنے بلکہ انھوں نے پسند کیا کہ وہ کابل یونی ورسٹی کے چانسلر بنیں اور تعلیمی اداروں کو ترقی دیں۔ ڈاکٹر اشرف غنی کی بیوی کا تعلق لبنان کے ایک عیسائی گھرانے سے ہے۔ افغانستان کی معاشی ترقی میں ایک مستقل کردار ادا کرنے کے بعد وہ اب سیاسی میدان میں بھی اپنا لوہا منوانا چاہتے ہیں۔ وہ ایک عملی انسان ہیں اور سائنسی اور علمی خطوط پر ملک کو چلانا چاہتے ہیں۔ افغانستان میں طالبان کے حوالے سے بھی ان کا موقف نرم ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ملک میں امن کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ بامعنی مذاکرات کیے جائیں اور ان کو قومی دھارے میں شامل کیا جائے۔

ڈاکٹر اشرف غنی کے مقابلے میں ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ افغانستان کے ایک مسلمہ قومی رہنما ہیں۔ ان کے والد غلام محی الدین خان، ظاہر شاہ کے دور حکومت میں سینیٹر تھے۔ انھوں نے ۱۹۷۷ء میں کابل یونی ورسٹی سے میڈیکل کی ڈگری حاصل کی اور پھر ماہر امراض چشم کی حیثیت سے النور ہسپتال کابل میں خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۸۴ء میں پاکستان ہجرت کی اور وادیِ پنج شیر میں کمانڈر احمد شاہ مسعود کے ساتھ روسیوں کے خلاف جہاد میں شامل ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں نجیب انتظامیہ کے خاتمے اور مجاہدین حکومت کے قیام کے بعد بھی وہ احمد شاہ مسعود کے ساتھ وزارت دفاع کی ترجمانی کرتے رہے۔ پھر وزیر خارجہ بنے اور عالمی سطح پر ان کی شہرت ہوئی۔ نائن الیون کے بعد وہ پھر وزارتِ خارجہ ہی کے نمایندے کے طور پر بون کانفرنس میں شامل ہوئے۔ صدر حامد کرزئی کے

پہلے دور میں وہ بحیثیت وزیر خارجہ کابینہ کے اہم رکن اور ترجمان تھے۔ ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں وہ صدر حامد کرزئی کے مقابلے میں ایک مضبوط صدارتی اُمیدوار رہے اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔

موجودہ انتخابات میں وہ صلاح الدین ربانی، جو استاد برہان الدین ربانی کے صاحبزادے ہیں، کی قیادت میں جمعیت اسلامی افغانستان کی جانب سے صدارتی اُمیدوار تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھ حزب اسلامی کے ایک مضبوط سیاسی دھڑے ارغندیوال گروپ کو ملایا اور ان کے انجینیر محمد خان کو نائب صدر اول کا اُمیدوار بنایا۔ اس کے علاوہ ہزارہ برادری کے استاد محقق کو نائب صدر بنا کر انھوں نے ایک قومی قیادت کا تصور پیش کیا۔ جہادی پس منظر کے باوجود ان کی شہرت ایک لبرل اور قوم پرست رہنما کی ہے۔ وہ طالبان کے مخالف ہیں۔ بھارت اور روس سے ان کے اچھے تعلقات ہیں۔

ڈاکٹر اشرف غنی اور ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کی مخلوط حکومت کا تصور بہت سارے افغانیوں کے لیے ناقابل فہم ہے۔ امریکی دباؤ پر انھوں نے آپس میں معاہدہ تو کرلیا لیکن اس کے عملی تقاضے پورے کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دونوں کیمپوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو اس گٹھ جوڑ سے خوش نہیں۔ امریکیوں کو بھی موجودہ انتخابات سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آرہیں۔ حامد کرزئی کا متبادل تلاش کرنا ان کے لیے دردسر بنتا جا رہا ہے۔ جان کیری جتنے بھی کابل کے دورے کریں ہر بار ان کو ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر اشرف غنی مسلسل بیان دے رہے ہیں کہ وہ ایک کمزور صدر بننا پسند نہیں کریں گے۔ بہرحال آنے والے دنوں میں افغانستان میں امریکیوں کے لیے مشکلات و مسائل میں اضافہ ہوگا اور امریکی افواج کے انخلا کے پروگرام میں تاخیر کا باعث بن سکتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں ظلم کی سیاہ رات

سلیم منصور خالد

مسلم دنیا یوں تو بہت سے داخلی اور خارجی مسائل اور بحرانوں سے دوچار ہے، لیکن ان میں سب سے زیادہ تکلیف دہ صورتِ حال وہ ہے، جس میں خود ہم وطن اور ہم نسل مسلمان، اپنے ہی ہم وطنوں سے ظلم وتشدد کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اور پھر اس بہتے ہوئے خون اور تباہ کی جانے والی زندگیوں کو اپنی قومی ترقی کا وسیلہ بتاتے ہیں۔ اس سفاکی اور شرمناکی کے لیے بے غیرتی اور غداری سے کم لفظ استعمال کرنا ممکن نہیں۔

عالم اسلام اور خصوصاً عالم عرب میں اسرائیل کے نام سے ایک ناجائز حکومت کے ہاتھوں امریکا ویورپ جو حیوانی کھیل کھیل رہے ہیں، اسی سے ملتا جلتا حیوانی اور غیرانسانی رویہ، ہندو قوم پرست ریاست ہندستان اپنائے ہوئے ہے۔ اس نے ایک جانب ۶۸ برس سے کشمیر کے مسلمانوں کو محکوم بنا کر ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں تو دوسری جانب بنگلہ دیش کی مسلم ریاست کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس سیاہ رات کے اندھیرے گہرے ہوتے جارہے ہیں۔ بنگلہ دیش کے محبِ وطن، اسلام دوست اور مسلم قوم پرست بنگلہ دیشی اپنے ملک میں ایک عذاب سے گزر رہے ہیں، جس کا ماسٹر مائنڈ بھارت ہے اور اس کے ایجنڈے کو بنگلہ دیش میں نافذ کرنے کا ذریعہ عوامی لیگ اور اس کی مددگار تنظیمیں ہیں۔

عوامی لیگ نے دسمبر ۲۰۰۸ء میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد سے بنگلہ دیش کی قومی سلامتی کو بھارتی مفادات کے سامنے سرنڈر کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے ہیں، جن کی بنگلہ دیش کے دُور اندیش اور اپنی قومی آزادی و اسلامی تہذیبی تشخص کو تحفظ دینے والے افراد اور تنظیموں نے کھل کر مخالفت کی۔ جواب میں بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' کے زیراثر بنگلہ دیش کی متعدد این جی اوز اور عوامی لیگی

حکومت نے بڑے پیمانے پر ریاستی مشینری کو استعمال کر کے ان آوازوں کو کچلنے کا راستہ اختیار کیا ہے۔

حکومت نے سب سے پہلے بنگلہ دیش جماعت اسلامی کے خلاف عدالتی ڈرامے کا آغاز کیا۔ اُس کے بزرگ رہنماؤں اور فعال کارکنوں کو گرفتار کر کے نام نہاد 'انٹرنیشنل کرائمز ٹریبونل' (ICT) قائم کر کے مقدمات چلانے شروع کیے۔ اس خصوصی عدالت پر بنگلہ دیش کے قانونی حلقوں، راست فکر دانش وروں اور صحافتی تنظیموں نے زبردست احتجاج کیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ (HRW) اور دیگر بین الاقوامی تنظیموں نے اس انتقامی ڈرامے کو مسترد کر دیا۔ مگر عوامی لیگی حکومت نے پوری ڈھٹائی سے، سزاے موت سنائے جانے والے فیصلوں کا نہ صرف اعلان کیا، بلکہ ۱۲دسمبر ۲۰۱۳ء کو عبدالقادر مُلّا کو پھانسی دے بھی دی۔ اس عدالتی قتل عام پر دنیا بھر نے برملا احتجاج کیا، لیکن یہ انتقامی عدالتی عمل رک نہیں سکا۔ اس وقت بھی جماعت اسلامی اور بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی(BNP) کے قائدین کو سزائیں سنائی جارہی ہیں، اور انھیں اپنے دفاع کے لیے آزادانہ طور پر بنیادی عدالتی سہولیات تک بھی میسر نہیں ہیں۔

یادرہے کہ اس نام نہاد عدالت (ICT) کے چیف جج مسٹر نظام کی شرمناک گفتگو کو ۲۰۱۲ء میں سکائپ سے ریکارڈ کر کے اکانومسٹ لندن اور بنگلہ دیش کے اخبارات نے شائع کر کے بتایا کہ یہ عدالت حکومت کی ہدایات پر فیصلے کر رہی ہے نہ کہ قانون اور عدل کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق۔

اسی طرح بنگلہ دیش میں اظہار راے کے ذرائع پر بری طرح پابندیاں عائد ہیں، جس کی چند مثالیں دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہاں جبر وظلم کا راج کس طرح اپنے شہریوں کی زندگی کو عذاب بنا رہا ہے۔ ۲۷/اپریل ۲۰۱۰ء کو نجی شعبے میں سب سے بڑے ٹی وی نیٹ ورک 'چینل ون' کو اس لیے بند کر دیا گیا کہ وہ حزب اختلاف کی خبریں نشر کرتا ہے۔ ۲۲/اگست ۲۰۱۱ء کو اطلاعاتی ترسیل کے سب سے مؤثر نجی ادارے 'شیر شا نیوز' (Sheersha News) کو کام کرنے سے روک دیا، اور اس کا سبب بھی حزبِ اختلاف کی خبریں نشر کرنا تھا۔ ۱۶ فروری کو حکومت کی بھارت نواز پالیسیوں پر تنقید کرنے والے 'سونار بلاگ' کو بند کر دیا گیا۔ ۱۱/اپریل ۲۰۱۳ء کو بنگلہ دیش میں حزبِ اختلاف کے سب سے بڑے حامی اخبار امار دیش (Amar Desh) کے مدیر کو اس بنا پر گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ انھوں نے نام نہاد عدالتی جج مسٹر نظام کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی گفتگو کو

شائع کیا تھا، حالانکہ یہ گفتگو اکانومسٹ لندن بھی شائع کرچکا تھا۔ ۱۴/اپریل ۲۰۱۳ء کو حکومتی مسلح ایجنسیوں نے اسلامی قوتوں کے سب سے بڑے اور قدیم اخبار سنگرام کے دفاتر پرحملہ کردیا۔

۵ مئی ۲۰۱۳ء کو 'ڈی گنتا ٹیلی وژن' (Diganta TV) اور 'اسلامک ٹیلی ویژن' پر اس لیے پابندی عائد کردی کہ انھوں نے 'حفاظتِ اسلام' تنظیم کے پُرامن احتجاجی دھرنے کو کچلنے کے حکومتی قتلِ عام کی تصاویر دکھائی تھیں۔ حفاظت اسلام نامی 'تنظیم' جو علما اور دینی طالب علموں پر مشتمل ہے، کے پُرامن احتجاج ۵ مئی ۲۰۱۳ء کو ۱۰ ہزار مسلح اہل کاروں کے ذریعے کچل دیا گیا۔ بیسیوں طالب علموں کی لاشوں کا آج تک نشان نہیں ملا۔ صحافیوں کو ڈرانے، اخبارات کی اشاعت کو معطل کرنے اور میڈیا کی نشریات کو خراب کرنے کا کھیل پوری قوت سے جاری ہے۔ اس جارحیت پر ۱۶ قومی اخبارات کے ایڈیٹروں نے ایک مشترکہ بیان میں حکومتی کارروائیوں کی مذمت کی اور مطالبات پیش کیے، جنھیں بھارتی کٹھ پتلی حکومت نے مسترد کردیا۔ درحقیقت عوامی لیگ حکومت کی جڑ ڈھاکہ میں نہیں، نئی دہلی سے خوراک حاصل کرتی ہے۔

ایک غیرآئینی اور غیراخلاقی حکومت کی سربراہ حسینہ واجد درحقیقت اپنے والد شیخ مجیب کی جابرانہ انتقامی پالیسیوں کا تسلسل ہے، جس نے فروری ۱۹۷۵ء میں پورے بنگلہ دیش میں سیاسی پارٹیوں کو ختم کرکے ایک پارٹی کی حکومت قائم کی تھی اور پھر جون ۱۹۷۵ء کو دستور میں چوتھی ترمیم کرکے ایک پارٹی اور ایک اخبار کا کالا قانون نافذ کیا گیا تھا۔ ان اقدامات کے لیے اسے دہلی سرکار کی سرپرستی حاصل تھی۔ اسی طرح جولائی ۲۰۱۴ء میں مولانا مودودی کی کتب کو مساجد اور تعلیمی اداروں کی ۲۴ ہزار لائبریریوں میں رکھنے پر پابندی لگادی گئی۔ پھر حسینہ واجد نے ۱۷/اگست ۲۰۱۴ء کو دستور میں ۱۶ویں ترمیم کا مسودہ کابینہ سے منظور کرایا ہے، جس کے نتیجے میں اعلیٰ عدلیہ، عملاً اس طرح حکومت کے رحم وکرم پر ہوگی کہ ججوں کا مواخذہ عدالتی کمیشن نہیں کرے گا بلکہ براہِ راست پارلیمنٹ ہی ججوں کی قسمت کا فیصلہ کیا کرے گی۔

بنگلہ دیش کو ایک بڑے جیل کی شکل دے کر ہزاروں سیاسی بلکہ سماجی کارکنوں تک کو جیلوں میں ٹھونسا جاچکا ہے۔ بنگلہ دیش میں اس وقت ۶۲۹ پولیس اسٹیشن ہیں جہاں پر صرف ۲۰۱۲ء میں ۲ لاکھ ۲۹ ہزار ۵سو ۸۵ افراد کو گرفتار کرکے مختلف اوقات میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ۲۰۱۳ء میں یہ تعداد دگنا

ہوگئی۔ جیلوں میں قید بزرگوں، لیڈروں اور کارکنوں کو قانونی، طبی اور بنیادی سہولتیں تک میسر نہیں۔

جماعت اسلامی اور طالب علموں کی تنظیم اسلامی چھاترو شبر (اسلامی جمعیت طلبہ) کے ہزاروں کارکنوں کو جیلوں میں بند' سیکڑوں کارکنوں کو زخمی اور درجنوں کارکنوں کو گولی مار کر قتل کیا جاچکا ہے، جب کہ سیکڑوں کارکن طالب علموں کو تعلیمی اداروں سے بے دخل کیا جاچکا ہے۔

اسلامی چھاترو شبر کے کارکنوں پر تشدد کے لیے RAB (ریپڈ ایکشن بٹالین)، بارڈر گارڈز بنگلہ دیش (BGB)، پولیس اور عوامی لیگ کے غنڈا عناصر اور چھاترو لیگ کے دہشت گردوں کی مشترکہ ٹیم متحرک ہے۔ شبر کے جن سیکڑوں کارکنوں کو زخمی کیا گیا ہے ان میں سے بہت سوں کو زندگی بھر معذور بنانے کے لیے' ان کی دونوں ٹانگوں پر قریب سے گولیاں مار کر اپاہج کر دیا گیا ہے، یا پھر کہنیوں میں گولیاں مار کر ہاتھوں سے معذور کر دیا گیا ہے۔ اس نوعیت کے خوف ناک تشدد اور باقاعدہ انداز سے ظلم کی مثالیں عصرِ حاضر میں کہیں نہیں دیکھی گئیں۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا میں اس کے خلاف آواز بلند نہیں ہو رہی۔

گذشتہ برس ایک طالب علم دلاور حسین کو، جو اسلامی چھاترو شبر سے تعلّق رکھتے ہیں، ڈھاکا سے گرفتار کر کے ۳۵۲ مقدمات میں ملوث کیا۔ ۴۵ روز تک تشدد کے دوران ان کے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن جڑ سے اکھاڑ لیے گئے اور اتنا تشدد کیا کہ دلاور کے جسم کا آدھا حصّہ مفلوج ہوگیا ہے۔ یہ ایک مثال نہیں بلکہ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جنھیں بیان کرتے ہوئے روح کانپ اُٹھتی ہے۔

۲۰۱۴ء کے جون میں اسلامی چھاتری شنگھستا (اسلامی جمعیت طالبات) کی ۳۲ کارکنان کو بھی توہین آمیز طریقے سے گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا۔

معلومات کے اس برق رفتار زمانے میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور کوئی اس ظلم کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔ یہ سب کچھ بنیادی انسانی حقوق کی پامالی اور بے حرمتی ہے اور انسانی حقوق کا تعلّق سرحدوں کی قید سے مشروط نہیں۔ اس لیے دنیا کے کونے کونے سے عوامی لیگی کٹھ پتلی حکومت کے اس ظلم کے خلاف آواز بلند ہونی چاہیے۔ نام نہاد انٹرنیشنل کرائمز ٹریبونل کو توڑا جائے۔ گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے۔ جعلی انتخاب کی پیداوار حکومت کو برطرف کر کے نئے انتخابات کرائے جائیں اور بھارتی تسلط سے بنگلہ دیش کے عوام کو آزادی دلائی جائے۔

رسائل و مسائل

قربانی سے متعلق متفرق سوالات

سوال : گھر کے ہر ہر فرد کی طرف سے ایک ایک قربانی ضروری ہے یا ایک قربانی تمام گھر والوں کی طرف سے کافی ہے؟ قربانی کرنا زیادہ افضل ہے یا قربانی کے پیسے صدقہ کر دینا؟

جواب: قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مؤکدہ ہے۔ نبی اکرمؐ نے اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے دو تندرست مینڈھے ذبح کیے تھے اور فرمایا تھا کہ: ''اے اللہ! یہ میری طرف سے میرے گھر والوں کی طرف سے اور میری اُمت میں سے جن لوگوں نے قربانی نہیں کی ان لوگوں کی طرف سے ہے''....

رہا یہ مسئلہ کہ قربانی زیادہ افضل ہے یا قربانی کے روپے کو صدقہ کرنا، تو میری رائے یہ ہے کہ بلاشبہ قربانی کرنا زیادہ افضل ہے۔ اس لیے کہ قربانی ایک عبادت ہے جس کا مقصد حضرت ابراہیمؑ کی سنت کو برقرار اور زندہ رکھنا ہے۔ یہ عبادت ہمیشہ اس عظیم الشان واقعے کی یاد دلاتی رہتی ہے جب ابراہیمؑ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں اسی کی بارگاہ میں قربان کرنے چلے تھے۔ اپنے رب سے محبت کی یہ ایسی مثال ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے پیارے بندے کو اس کا یہ صلہ دیا کہ اس کے اس فعل کو قیامت تک کے لیے یادگار بنا دیا۔ ہر قوم اپنے اہم دن مثلاً آزادی کا دن یا جنگ میں فتح کا دن وغیرہ کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ہر سال اس کا جشن مناتی ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ قربانی کر کے اس عظیم الشان واقعے کی یاد تازہ رکھیں۔ اس لیے قربانی کرنا قربانی کی قیمت کو صدقہ کرنے کے مقابلے میں زیادہ افضل اور احسن ہے۔

البتہ اگر قربانی کسی میت کی طرف سے کی جارہی ہے تو میری راے یہ ہے کہ اگر قربانی کسی ایسے علاقے میں کی جائے جہاں لوگوں کو گوشت کی زیادہ ضرورت ہے تو وہاں قربانی کرنا زیادہ افضل ہے، اور اگر قربانی کسی ایسے علاقے میں کی جائے جہاں پہلے سے کافی گوشت موجود ہو اور لوگوں کو پیسوں کی زیادہ ضرورت ہو تو وہاں قربانی کی قیمت کو صدقہ کرنا زیادہ افضل ہے۔

گھر کے تمام افراد کی طرف سے صرف ایک قربانی کا جانور کافی ہے۔ کیوں کہ نبی اکرمؐ نے جب قربانی کی تو فرمایا کہ اے اللہ! یہ محمدؐ اور اس کے گھر والوں کی طرف سے ہے۔ ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں ہم میں سے ہر شخص اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے صرف ایک بکری ذبح کرتا تھا۔ لیکن اس کے بعد لوگوں نے فخر ومباہات کے لیے زیادہ قربانیاں کرنی شروع کردیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ (ڈاکٹر یوسف قرضاوی، فتاویٰ یوسف قرضاوی، ص۱۹۴-۱۹۶)

بچپن کا حج

س: کیا سنِ بلوغ سے قبل حج کرنے سے فرض حج ادا ہوجائے گا؟ اس سن میں اگر کسی نے حج کیا اور اس کے بعد گناہ کی زندگی گزاری تو کیا اس کا حج باطل ہوجائے گا اور اسے دوبارہ حج کرنا ہوگا؟

ج: سنِ بلوغ سے قبل حج کرنے سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی۔ حج کی فرضیت اسی وقت ساقط ہوتی ہے جب اسے سنِ بلوغ کے بعد ادا کیا جائے۔

حج کی ادایگی کے بعد بھی کوئی شخص بُرے کاموں میں ملوث رہا تو اس سے اس کا حج باطل نہیں ہوگا کیوں کہ بُرے کاموں کی وجہ سے اچھے اور نیک اعمال رائیگاں نہیں ہوتے، البتہ ان کے ثواب میں کمی ضرور ہوجاتی ہے۔ قیامت کے دن ہر شخص کے سامنے اس کے چھوٹے بڑے، اچھے اور بُرے سارے اعمال پیش کیے جائیں گے اور انھی اعمال کی بنیاد پر اس کا حساب کتاب ہوگا۔ فرمانِ الٰہی ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (الزلزال۹۹: ۷-۸) ’’جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے وہ اس کو دیکھ لے گا‘‘۔

بہرحال، بندۂ مومن سے یہی اُمید کی جاتی ہے کہ حج کا اثر اس کے اعمال میں ظاہر ہو۔ اپنی گذشتہ زندگی میں جن بُرے کاموں میں وہ ملوث رہا، ان سے سچّی توبہ کرے اور آیندہ زندگی اللہ کی اطاعت میں گزارنے کا پکا ارادہ کرے اور اس کے لیے پوری کوشش کرے۔ اللہ سے اپنے رشتے کو مضبوط تر کرے اور یہی وہ حج مبرور ہے جس کا صلہ جنت ہے۔

اگر صاحبِ سوال نے سنِ بلوغ سے پہلے حج کیا ہے تو انھیں اب دوبارہ حج کرنا چاہیے تاکہ فرضیت ادا ہوسکے، البتہ پہلے حج کا ثواب انھیں ضرور ملے گا۔ (ایضاً، ص ۱۸۳)

بقرعید کے چاند کے بعد بال یا ناخن کٹوانا

س : کیا بقرعید کا چاند دیکھنے کے بعد اس شخص کے لیے ناخن یا بال کٹوانا جائز ہے جو قربانی کرنا چاہتا ہو؟

ج: حنبلی مسلک کے مطابق قربانی کرنے والے شخص کے لیے چاند دیکھنے کے بعد بال یا ناخن کٹوانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ حجاج کرام احرام کی حالت میں یہ چیزیں نہیں کٹواتے۔ اس لیے اس کیفیت کو زندہ رکھنے کے لیے قربانی کرنے والے کو بھی یہ چیزیں نہیں کٹوانی چاہییں۔ البتہ راجح قول یہ ہے کہ ایسا کرنا صرف مکروہ ہے۔ اگر کسی نے ناخن کٹوایا یا بال بنوا لیے تو اس پر کوئی فدیہ نہیں ہے۔ اسے چاہیے کہ اللہ سے مغفرت طلب کرے اور بس۔ اگر کسی شخص کو زیادہ دن تک ناخن یا بال چھوڑنے سے تکلیف ہوتی ہو اور اس نے یہ چیزیں کٹوا لیں تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ (ایضاً، ص ۱۹۶-۱۹۷)

کتاب نما

مولانا عبدالسلام نیازی، مرتبہ: راشد اشرف۔ ناشر: اُردو اکیڈمی، ۳۳-سی، ماڈل ٹاؤن اے، بہاول پور۔ فون: ۹۶۸۴۱۵۰-۰۳۰۰۔ صفحات: ۲۳۶۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔

مولانا عبدالسلام نیازی (۱۸۶۴ء-۳۰ جون ۱۹۶۶ء) ایک ایسے عالم، فلسفی اور سلوک و طریقت کے رمز شناس تھے کہ درِتذکار بند کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ کتاب علم و عرفان کے گوہر شناسوں کے لیے ایک تحفہ ہے۔

جماعت اسلامی سے وابستگان کے لیے نیازی صاحب کی اہمیت اس حوالے سے ہے کہ سیدابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۷ برس کی عمر میں ان کی شاگردی سے بھی فیض پایا۔ تاہم، اس حوالے سے ہٹ کر بھی مولانا عبدالسلام نیازی کی شخصیت کی قوسِ قزح اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے اور انھیں جاننے کی پیاس بڑھاتی چلی جاتی ہے، حالانکہ: ''مولوی [عبدالسلام] صاحب ایک حیرت انگیز مجموعہ اضداد تھے'' (ص ۱۰۶)۔ اس انداز کو اپنانے کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ''مولوی صاحب اس نظریے پر عمل پیرا ہوں، اور ایسی حرکات جان بوجھ کر کر گزرتے ہوں تاکہ دیکھنے والے ان کو قابلِ نفرت سمجھنے لگیں۔ لیکن مذلت و رُسوائی کی ان کوششوں کے باوجود ان کی تعظیم و تکریم میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا اور لوگ اُن کی اِن باتوں کو بھی قلندرانہ اداؤں سے تعبیر کرتے رہے'' ۔(ص ۴۷)

اس کتاب کے تعارف کے لیے داخلی شہادتوں سے گفتگو کو یوں پھیلایا جاسکتا ہے: ''مولانا نیازی کا وطن میرٹھ تھا، جوانی میں دلی آ گئے تھے'' (ص ۲۳)۔ ''سر آرنلڈ کو عربی پڑھائی اور ان سے انگریزی سیکھی۔ جرمن مستشرق ڈاکٹر ہریمن کو عربی پڑھائی اور ان سے جرمن اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت، فرانسیسی، جرمن، لاطینی سمیت ۲۰ زبانوں پر عبور رکھتے تھے'' (ص ۳۱، ۳۲)۔ اسی طرح ''ابوطاہر کے بقول: مولانا نیازی سریانی، عبرانی، مکرانی، حمیری وغیرہ

زبانوں [پر بھی] عبور رکھتے تھے، اور آثارِ قدیمہ اور کتبات کی وضاحت کر سکتے تھے" (ص ۱۸۸)، جب کہ "سنسکرت زبان وادب کے اکتساب کے لیے انھوں نے برسہا برس ایک سادھو کے بھیس میں ہردوار، متھرا، پریاگ اور کاشی میں علماے ہنود کی صحبت میں گزارے"۔ (ص ۳۲، ۸۹)

"مولانا عبدالسلام نیازی کا پسندیدہ موضوع وحدت الوجود تھا" (ص ۳۷)۔ "وہ بڑے خدارسیدہ اور قلندر منش تھے۔ قوالی سننے کا شوق تھا" (ص ۳۸، ۳۹)۔ "ان کی صحبت میں بہ یک وقت علم دوست حضرات اور جہلا دونوں موجود ہوا کرتے تھے" (ص ۹۸)۔ "علامہ اقبال کے اشعار کو بڑی دل چسپی اور بہت ذوق وشوق کے ساتھ سنا کرتے تھے، اور انھیں علومِ مشرقی و مغربی کی پوٹ کہا کرتے تھے۔ خود علامہ اقبال بھی مولوی صاحب سے بہت عقیدت مندانہ انداز میں ملا کرتے تھے" (ص ۱۰۳)۔ مولانا نیازی کہا کرتے تھے: "آدمی اور انسانیت الگ الگ لفظ ہیں۔ غالب نے جب کہا تھا کہ "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" تو اسی جانب اشارہ کیا تھا"۔ (ص ۱۲۳)

مولانا عبدالسلام نیازی: "مشرقی علوم کے حرفِ آخر تھے۔ قرآن، حدیث، منطق، حکمت، تصوف، عروض، معنی و بیان، علم الکلام، تاریخ، تفسیر، لغت، لسانی قواعد، ادب اور شاعری کے امام تھے" (ص ۱۳۸) اور: "ان علما کی آخری یادگار تھے، جن پر اسلامی تمدن کبھی ناز کیا کرتا تھا"۔ (ص ۱۱۴)

چونکہ یہ مجموعہ مختلف تحریروں کا گلدستہ ہے، اس لیے کہیں کہیں تکرار ہے اور کچھ روایت کے متحارب اور الحاقی بیانات بھی دَر آئے ہیں۔ مرتب نے فاضل لوازمے کو بلاتبصرہ پیش کردیا ہے کہ قاری اپنے ذوق کے مطابق اخذ و اکتساب کرے۔ یوں تو تمام تحریریں دل چسپ ہیں، البتہ رزمی جے پوری، مسعود حسن شہاب، مقصود زاہدی، خلیق انجم، انور سدید، مسعود حسن شہاب اور عاصم نعمانی کی تحریریں خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔ اُردو اکیڈمی بہاول پور اور راشد اشرف اس خدمت پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (سلیم منصور خالد)

Urdu Works of Abu al-A'la Maududi، [ابوالاعلیٰ مودودی کی اُردو تصانیف]، نوریکو ساساوکی۔ ناشر: مرکز براے اسلامک ایریا اسٹڈیز، اوساکا یونی ورسٹی، جاپان۔ صفحات: ۱۱۴۔ قیمت: درج نہیں۔

کیوٹو (Kyoto) یونی ورسٹی، جاپان کی فعال اور بڑی یونی ورسٹیوں میں سے ایک ہے۔

اس کے ایریا اسٹڈی منصوبے کے تحت 'جنوبی ایشیا میں مطالعاتِ اسلام' کے سلسلے میں بعض تحریکوں اور شخصیتوں کا مطالعہ کیا جاتا رہا ہے۔ اسی ضمن میں یونی ورسٹی کی ایک طالبہ نوریکو ساساوکی (Noriko Sasaoki) کو سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (بانی جماعت اسلامی) کی تصانیف کی وضاحتی فہرست تیار کرنے کا کام سونپا گیا۔ نوریکو کا ماحصلِ تحقیق جاپانی زبان میں تیار ہوا تھا، اب اسے انگریزی زبان میں منتقل کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس تحقیق کے سلسلے میں نوریکو نے کئی بار پاکستان کا سفر کیا۔ وہ ہفتوں اور مہینوں یہاں مقیم رہیں۔ مولانا کی تمام دستیاب کتابیں خرید کر لے گئیں۔ تصانیفِ مودودی کا ایک بڑا ذخیرہ اوساکا یونی ورسٹی اور وہاں کے ایسوسی ایٹ پروفیسر سویامانے کے کتب خانے میں موجود ہے۔ سویامانے اُردو کے استاد اور عالم ہیں اور زیرِنظر تحقیقی کام انھی کی دل چسپی سے اور انھی کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دیباچہ بھی انھی کا تحریر کردہ ہے۔

نوریکو نے اپنے دیباچے میں اختصار کے ساتھ مولانا مودودی کے سوانح، جماعت اسلامی کا تعارف، جماعت کے قیام کا احوال اور پھر اپنے زیرِنظر تحقیقی کام کی نوعیت بیان کی ہے۔ انھوں نے راقم کی تیار کردہ فہرست ''تصانیف مودودی: ایک اشاعتی اور کتابیاتی مطالعہ'' مشمولہ: تذکرہ سیّد مودودی: ۳ اور ''سیّد مودودی: فکری و قلمی آثار'' (مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد) مشمولہ: ابوالاعلیٰ مودودی، علمی و فکری مطالعہ سے بھی مدد لینے کا اعتراف کیا ہے۔

تصانیف مودودی کی یہ وضاحتی فہرست نہایت سلیقے سے اور تصانیف مودودی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے مرتب کی گئی ہے (قرآن اور حدیث سے متعلق کتابیں، مولانا کی مرتبہ اور ان کی نگرانی میں تیار شدہ کتابیں، کتابچے، خطوں کے مجموعے، مولانا کی ترجمہ کردہ کتابیں دوسروں کی مرتبہ کتابیں)۔ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ مولانا کی فلاں کتاب یا کتابچہ اس فہرست میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ دراصل یہ کتاب بھی مولانا مودودی، جماعت اسلامی اور سلسلۂ تحریکاتِ اسلامی کے مطالعات کی ایک کڑی ہے جو گذشتہ صدی کے آخری برسوں سے کئی ممالک خصوصاً جاپان میں شروع کیے گئے ہیں۔ خود سویامانے بھی اس سلسلے پر کچھ لکھ چکے ہیں۔ مولانا مودودی اور ان کے نظریات سے جاپانیوں کی دل چسپی کے بارے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے بھی کچھ معلومات مہیا کی ہیں۔ (رفیع الدین ہاشمی)

فصوص الحکم، شیخ محی الدین ابن عربی، ترجمہ و تشریح: مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی، سلیس متن: محمد عبدالاحد صدیقی۔ ملنے کا پتا: کتاب محل، دربار مارکیٹ، میلارام روڈ، لاہور۔ فون: ۸۸۳۶۹۳۲-۰۳۲۱۔ صفحات: ۳۱۳۔ قیمت: ۶۰۰۔

شیخ محی الدین ابن عربی، نظریۂ وحدت الوجود کے سب سے بڑے مبلّغ اور مفسر سمجھے جاتے ہیں۔ فصوص الحکم ان کی ایک بڑی اور معروف تصنیف ہے۔ ابن عربی مفکر اور عالم ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو کی فکریات پر ان کے اثرات ہمہ جہت ہیں۔ فصوص الحکم کے کئی اُردو ترجمے ہوئے اور متعدد شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب مدارس کے مختلف نصابات میں بھی شامل رہی ہے۔ مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی (استاد، شعبۂ اسلامیات جامعہ عثمانیہ) نے بھی اس کا ایک ترجمہ کیا اور اس کی شرح بھی لکھی، مگر یہ ترجمہ اور شرح زبان و بیان کے اعتبار سے بہت اَدق اور مشکل تھی۔ ان کے ایک نبیرہ محمد عبدالاحد صدیقی نے اس کی زبان اور اسلوب کو موجودہ عہد کی زبان میں ڈھالا تاکہ تفہیم آسان ہو، چنانچہ اب یہ ترجمہ اور شرح بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل: ''ہر شخص کے لیے قابلِ فہم اور قابلِ استفادہ ہوگئی ہے''۔ اُمید ہے فصوص الحکم کے قارئین کے لیے یہ کتاب مفید اور سودمند ثابت ہوگی۔ (رفیع الدین ہاشمی)

طفیل قبیلہ، محمد اسلم جمال۔ ناشر: جمال الدین سنز، ۴۴-عمر مارکیٹ، لنک ریلوے روڈ، لاہور۔ فون: ۳۷۶۵۷۲۵۲-۰۴۲۔ صفحات (مجلّاتی سائز): ۴۳۰، مع اشاریہ۔ قیمت: ۶۰۰ روپے۔

بیسویں صدی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م: ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء) داعیِ تحریک اسلامی تھے، تو ان کے دستِ راست میاں طفیل محمد (م: ۲۵ جون ۲۰۰۹ء) معمارِ تحریک اسلامی تھے۔ میاں صاحب کی للّٰہیت، خلوص، ایثار اور خدمتِ دین ضرب المثل ہے۔

ان کے داماد محمد اسلم جمال نے اس عظیم شخصیت کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بہت محبت سے یک جا کر دیا ہے۔ اگرچہ کتاب کا محور میاں صاحب کی شخصیت ہے، مگر اس تذکرے میں ان کا خاندانی پس منظر اور ان کے اعزّہ و اقربا کا ذکر بھی تفصیلاً آ گیا ہے، جب کہ جماعت اسلامی کے مختلف گوشے واقعاتی اور بیانیہ انداز میں سامنے آئے ہیں۔ بلاشبہہ بعض معلومات پہلے سے ریکارڈ پر موجود ہیں، مگر یہاں یک جا آ گئی ہیں۔

میاں طفیل محمد مرحوم کے دستِ راست چودھری رحمت الٰہی صاحب نے بجا فرمایا ہے: ''میاں صاحب شعائر اسلام کے سختی سے پابند تھے، بالخصوص نمازیں پورے خضوع وخشوع سے ادا فرماتے تھے'' (ص ۲۸)۔ اور محترم سید منورحسن کے بقول: ''فریضہ اقامتِ دین، ان کی بابرکت زندگی کا نصب العین اور جلی عنوان بنا۔ انھوں نے نماز کو اپنی زندگی کا امام قرار دیا ہوا تھا...... میاں صاحب ہمیشہ راضی برضا نظر آئے اور صبروتحمل کا کوہِ گراں دیکھے گئے''۔ (ص ۲۴-۲۶)

ان دو اقتباسات میں جو نکات نمایاں ہیں، ساری کتاب میں انھی کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔(سلیم منصور خالد)

اعتراف (شخصی خاکے)، سعید اکرم۔ ناشر: محمد احمد سعید۔ ملنے کے پتے: الہدیٰ صادق کالونی، سہگل آباد، چکوال۔ فون: ۵۸۲۶۸۴۰-۰۳۴۶۔ کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۲۵۔ قیمت: درج نہیں۔

۲۳ خاکوں کے اس مجموعے کا نام 'اعتراف' معنی خیز ہے۔ سرورق پر 'اعتراف' کے ساتھ 'شخصی خاکے' کی توضیح درج ہے۔ خاکے تو 'شخصی' ہی ہوتے ہیں اور اس لیے بعض اوقات انھیں، 'شخصیہ' اور خاکہ نگاری کو 'شخصیت نگاری' کا نام بھی دیا جاتا ہے مگر سعید اکرم صاحب نے انھیں 'شخصی خاکوں' کا نام اس لیے دیا ہے کہ یہ معروف شخصیتوں، دانش وروں، مشاہیر شعروادب یا اکابر سیاست کے نہیں، بلکہ یہ ان افراد کے خاکے ہیں جن سے خاکہ نگار کو اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی اور موجودہ (بڑھاپے) زمانوں میں واسطہ رہا۔ یہ ان کے گاؤں اور ان کے شہر کے مختلف کردار ہیں جن میں سے زیادہ تر اساتذہ ہیں (جن کے سامنے انھوں نے زانوے تلمذتہ کیا یا کچھ ایسے پروفیسر حضرات جو کالجوں میں ان کے رفیقِ کار رہے)۔

سیّد نیاز حسین شاہ (شاہ جی) گاؤں کی مسجد کے خطیب تھے مگر روایتی اماموں اور خطیبوں سے قطعی مختلف۔ عربی اور فارسی کے عالم، مطالعے کے رسیا اور خوش خطی کا ذوق رکھنے والے شگفتہ مزاج شخص تھے۔ ایک صاحبِ حیثیت (میاں بشیر سہگل) نے گاؤں میں سکول کھولا تو شاہ جی عربی فارسی کے استاد مقرر ہوگئے۔ اسی طرح حافظ فیروزالدین (حافظ جی) 'قناعت کی زندگی' کی ایک مثال تھے۔ نرے حافظ جی نہ تھے، اپنے وقت کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی موضوعات پر اعتماد کے ساتھ

بات کرتے اور دینی مسائل میں لوگوں کو اچھی خاصی رہنمائی فراہم کرتے۔ اسی طرح حافظ محمد صادق، اسی طرح پروفیسر چودھری سلطان بخش (پرنسپل) جو ڈسپلن کے معاملے میں ذرا سی رُو رعایت کے بھی قائل نہ تھے۔ سخت گیر اور سخت مزاج مگر طلبہ کے حق میں بہت شفیق۔ بہت انہماک سے پڑھاتے اور وقت سے پہلے کلاس کبھی نہ چھوڑتے۔ کلاس سے باہر بھی طلبہ کی تربیت اور ان کے ذہن کو جلا دینے کا سامان پیدا کرتے رہتے۔ 'ہماری مائیں' گاؤں کی ان روایتی ماؤں کا خاکہ ہے جو فقط کسی ایک بچے سے نہیں، بلکہ گاؤں اور گلی محلے کے سارے بچوں سے اپنے بچے کا سا پیار کرتی ہیں۔ ایسے حقیقی کرداروں میں ماسی ولایتاں، ماں بھاگی، ماں سرداراں اور ماں مکھی وغیرہ شامل ہیں۔ لکھتے ہیں: ''تو یہ تھی ہماری مائیں، جنھوں نے ہمیں پالا پوسا، بڑا کیا اور انسان بنایا۔ آج ہمارے اندر انسانیت نام کی کوئی رمق، احترام اور عزت کے جذبے کا کوئی شائبہ اور محبت کے مادے کا کوئی ذرہ موجود ہے تو یہ صرف ان ہستیوں کی دین ہے''۔ ان خاکوں میں آپ بیتی کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ پرانے وقتوں کی تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔

سعید اکرم صاحب نے یہ خاکے لکھ کر اپنے بقول: ''دل کے اوج فلک پر چمکنے والے ستاروں کو صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے'' (ص ۱۶)۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ''مجھے نشوونما دی اور اپنی محبتوں کی گود میں پال کر بڑا کیا''۔ (ص ۱۲۳)

لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالقیوم ملک کے بقول: ''انھوں نے اپنے محسنوں کی شخصیات کے نہایت ہی اعلیٰ خاکے کھینچ کر اپنی وفا اور اپنے قلم کا حق ادا کر دیا ہے''۔ طباعت و اشاعت، جلد بندی مناسب اور کاغذ عمدہ ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

نقوشِ زندگی (خودنوشت سوانح حیات)، مولانا محمد عبدالمعبود۔ ناشر: القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد، نوشہرہ۔ صفحات: ۲۵۲۔ قیمت: درج نہیں۔

خودنوشت سوانح عمریوں کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ معیاری سوانح عمری کے بارے میں متعدد آرا ملتی ہیں۔ مغربی ادبیات میں اس کے اصول و قواعد اور معیار کا پیمانہ مشرقی ادبیات سے مختلف ہے۔ تاہم آپ بیتی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے جو خود اس

نے بے کم و کاست قلم بند کردی ہو، جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔

زیرِنظر آپ بیتی مصنف کی زندگی کے حالات کی راست تصویر کشی ہے۔ ان کے موے قلم نے واقعات کے ایسے خوش نما پیکر تیار کیے ہیں کہ گذشتہ ۵۰ برس کے ملکی حالات سامنے آجاتے ہیں۔ مصنف ایک عالمِ دین ہیں، اپنی تعلیمی اور تدریسی زندگی کے کوائف کے علاوہ اپنے اساتذہ، پیرومرشد اور عزیز و اقارب سے متعلق اپنے روابط صاف صاف طریقے سے بیان کردیے ہیں۔ جس ماحول میں مصنف کی تعلیمی زندگی گزری، وہاں سیّد مودودیؒ کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا، چنانچہ زیرِنظر کتاب کے مطابق مصنف نے دل کھول کر اس محاذ آرائی میں حصّہ لیا جو اُس دور کے علما اور مولانا مودودیؒ میں جاری تھی۔ تحریری و تقریری مباحثے اور مناظرے بھی زوروں پر تھے۔

اس آپ بیتی میں مصنف نے ملکی اور غیرملکی استعمار کا ذکر بھی کیا ہے۔ بیرونِ ملک سفرناموں کے سلسلے میں بھارت کا سفر یادگار سفر کہا جاسکتا ہے، جس میں 'شیخ الہند سیمی نار' میں ایک مقرر کے پاکستان کے خلاف تبصرے پر مصنف اور ان کے ساتھی اجلاس کا بائیکاٹ کرتے ہوئے باہر چلے گئے (ص ۲۶۰)۔ اسی سفر میں آگرہ قلعے کی سیر کے موقعے پر یہ افسوس ناک واقعہ بھی پیش آیا کہ مصنف کے وفد کے ایک پاکستانی فرد کو قلعے کے دروازے پر اپنی ٹوپی اُتار کر قلعے کے محافظ ہندوؤں کے پاؤں پر رکھنی پڑی لیکن وہ پھر بھی راضی نہ ہوئے (ص ۲۶۱)۔ (ظفرحجازی)

امریکا زوال کی جانب، رضی الدین سیّد۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ فون: ۳۵۴۳۲۴۱۹-۰۴۲۔ صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۲۲۰ روپے۔

مصنف ایک منجھے ہوئے قلم کار ہیں۔ مختلف عنوانات پر کئی کتب کے مصنف ہیں۔ کراچی میں 'نیشنل اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ' کے کرتا دھرتا ہیں جہاں سے صہیونیت پر منظّم اور سائنٹی فک انداز میں ۱۵ قیمتی کتب شائع کی جاچکی ہیں۔ زیرتبصرہ کتاب میں مصنف نے امریکا کے خلاف عالمی نفرت، اخلاقی بے راہ روی، امریکی شرح پیدایش میں تیز رفتار کمی، معیشت کا زوال، امریکا پر یہودی اثرات، امریکا میں اسلحہ کی بہتات اور اس کے استعمال کے خطرناک اثرات، اور مختلف مفکرین کے خیالات اور آرا پیش کی ہیں۔ امریکا میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا جائزہ

بھی پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم اخلاقی زوال کا شکار ہو جائے اور جس کے امن و سلامتی کے تصورات اپنے لیے کچھ اور دوسروں کے لیے کچھ اور ہوں اور جو اپنی سیاسی اور سماجی غلبے کے خبط میں ہر اخلاقی اصول کو تاراج کر دے، اگر وہ ترقی کی معراج پر ہے تو لازماً تباہی کی طرف گامزن ہوگی اور یہی حال امریکا کا ہے۔ ہم روس کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ وہ افغان مجاہدین کے ساتھ معرکہ میں جس بُری طرح بکھرا اور ٹوٹا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجوہات وہی ہیں جو اُوپر بیان ہوئیں۔ اپنے گہرے مشاہدے کی بنیاد پر مولانا مودودیؒ نے ایک صدی قبل روس کے زوال کی پیش گوئی کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ امریکی زوال کی پیش گوئی بھی۔ بس اب وقت کا انتظار ہے! (شہزادالحسن چشتی)

حکایاتِ حکمت و دانش، ملک احمد سرور۔ ناشر: طٰہٰ پبلی کیشنز، ۱۹- ملک جلال الدین (وقف) بلڈنگ، چوک اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۰۳۳۳-۴۴۷۰۵۰۹۔ صفحات: ۲۶۴۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

مدیر بیدار ڈائجسٹ نے اپنے ماہنامے میں حکایاتِ حکمت و دانش کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ بڑے پیمانے پر اس کی پذیرائی ہوئی۔ چنانچہ قارئین کی بڑی تعداد اور پبلشر کے اصرار پر ملک صاحب نے زیرنظر کتاب میں کہانیوں اور تحریروں کا ایک انتخاب مختلف عنوانات (علم بارے مختلف حکایات، حکایاتِ شکر، امانت و دیانت، محنت و ہمت، ذہانت و فطانت، دوستی، سخاوت، لالچ اور بخل، وعدوں کی پاس داری اور متفرق حکایات) کے تحت مرتب کر دیا ہے۔

کہانیاں اور تحریریں مختصر ہیں۔ ایک صفحہ، دو صفحہ یا زیادہ سے زیادہ تین چار صفحے۔ کسی ایک مضمون یا کہانی کے آخر میں اگر جگہ بچ گئی ہے تو اسے کسی حدیث، دعا، اشعار یا دل چسپ واقعے سے پُر کر دیا ہے۔ تحریروں کی زبان آسان اور اسلوب سادہ ہے۔ پڑھنا شروع کریں تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک ایسے وقت میں، اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں اخلاقی قدروں کی گم شدگی سب سے بڑا مسئلہ ہے، تحفہ دینے کے لیے یہ بہت اچھی کتاب ہے جو چھوٹوں اور بڑوں سب کو گم شدہ دینی و اخلاقی قدروں کی بحالی کا احساس دلاتی ہے۔ بعض حکایات دوسری کتابوں سے نقل کی گئی ہیں مگر حوالے نامکمل ہیں جیسے ص ۱۸، ۵۷، ۹۵ وغیرہ۔ (رفیع الدین ہاشمی)

مدیر کے نام

عفت زین العابدین ، قصور

'قرآن پر عمل___ ایک منفرد تجربہ' (اگست ۲۰۱۴ء) میں سمیہ رمضان نے طلاق کے مسئلے پر جہاں معاشرتی رویے کی اصلاح کی ہے وہاں آیاتِ قرآنی کی تفہیم دل چسپ اسلوب میں عمدگی سے کی ہے۔ بجا کہا گیا ہے کہ اس مضمون میں قرآنِ حکیم کی آیات پر عمل اور اس کے حقیقی نفاذ کو جس طرح ممکن بنایا گیا ہے وہ ہزاروں درسِ قرآن بھی سنے جاتے تو آیات کی ایسی تفہیم حاصل نہ ہوسکتی۔

عبداللہ ، لاہور

'اسلام کیا ہے؟' (اگست ۲۰۱۴ء) پڑھ کر مریم جمیلہ مرحومہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ انھوں نے اسلام کا اختصار اور جامعیت سے بھرپور تعارف پیش کیا ہے۔ تاہم ان کا یہ کہنا کہ اسلام فنونِ لطیفہ کی حوصلہ شکنی کرتا ہے، وضاحت طلب ہے۔ اس پہلو کو اُجاگر کرنے کی ضرورت تھی کہ اسلام فنونِ لطیفہ کی حدود کا تعین کرتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

نسیم احمد ، اسلام آباد

'اسلامی نظام: سیاسی ذرائع سے قیام ممکن ہے؟' (اپریل، مئی ۲۰۱۴ء) کے تحت اہم نکات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ تاہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ موجودہ پارلیمنٹ (جو مجلس شوریٰ کا مقام رکھتی ہے) میں ایسے افراد کیسے لائے جائیں جو اہل، امانت دار اور دین کا علم رکھنے والے ہوں؟ اس سلسلے میں دستور کی دفعات ۶۲-۶۳ کچھ حدود قائم کرتی ہیں لیکن ان کو بروئے عمل لانے کے لیے جو قواعد وضوابط ہونے چاہییں وہ منظرعام پر نہیں آئے۔ دستور کی ہر دفعہ کے تحت تفصیلی ہدایات، قواعد وضوابط نافذ ہوتے ہیں۔ ان قواعد وضوابط کے نفاذ اور عام کرنے کے لیے اقدامات کی ضرورت ہے۔ اہلِ علم و دانش اور اربابِ اقتدار کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے تاکہ پاکستان کو واقعتاً اسلامی جمہوری ریاست کا عملی نمونہ بنایا جاسکے۔

مرزا محمد الیاس نے ارقم آفاق پرنٹر، بلال گنج سے چھپوا کر اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

C.P.L. 322 *Monthly* AALMI TARJUMAN - UL - QURAN **LAHORE.** **Ph:** 35427916 **Fax:** 35427915